جلد ۱۳۷ ماہ ربیع الآخر و جمادی الاولیٰ سنہ ۱۴۰۶ھ مطابق ماہ جنوری سنہ ۱۹۸۶ء عدد ۱

مضامین

مقالات

وفیات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

نومبر ۱۹۸۵ء کا آخری ہفتہ اسلام آباد میں عالمی قرآن کانگریس اور بین الاقوامی سیرت کانفرنس کی شرکت میں گذرا، وہاں سے حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کے یوم سالگرہ کی تقریب میں شریک ہونے کے لیے کراچی گیا جو ۱۲، ۱۳ دسمبر کو تھی۔

عالمی قرآن کانگریس کا انعقاد جناب حکیم محمد سعید صاحب کے ہمدرد فونڈیشن کی طرف سے بڑی خوش اسلوبی سے ہوا، یہ کوئی اسلامی تنظیم نہیں، اس کو آسٹریلیا کے ایک عیسائی نے قائم کیا تھا، اب جو چاہے اس کا اجلاس طلب کر سکتا ہے، چنانچہ اس کا تیسرا اجلاس پاکستان کے ہمدرد فونڈیشن کی طرف سے ہوا تو اس میں غیر مسلموں کے مقالات بھی سننے میں آئے، جس کے بعد اندازہ ہوا کہ اب قرآن فہمی ہمارے علماء کے دائرۂ فکر سے نکل رہی ہے، خود جدید ذہن کے مسلمان دانشور اس ربانی صحیفہ کو اپنی بدلتی ہوئی فکر کے مطابق سمجھنا چاہتے ہیں، اب ہمارے علماء پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ ان کے متجسس اور مضطرب ذہن کو اپنی عالمانہ اور متکلمانہ بصیرت سے مطمئن کریں، تاکہ آگے چل کر ان سے وہ یہ نہ کہہ سکیں کہ غضب ہے سطر قرآں کو چلیپا کر دیا تو نے۔

اسلام آباد کی بین الاقوامی سیرت کانفرنس کے اجلاس پاکستان کی روایتی شان کے مطابق ہوتے رہے، اچھے اچھے مضامین پڑھے گئے، خاکسار کا مقالہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رحمۃ للعالمین کی حیثیت سے کے عنوان سے تھا، اس میں ایران اور عراق کے نمایندوں کو اس طرح لڑتے دیکھا جیسے وہ سیرت کانفرنس کے بجائے کسی جنگی محاذ پر ہیں، اس سے سبھی حاضرین متحیر اور رنجیدہ ہوئے۔

پاکستان کے صدر جناب ضیاء الحق نے اپنے افتتاحی خطبہ میں حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کی سیرۃ النبیؐ کی جلد ہفتم پر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو ایک لاکھ روپیے کا انعام دینے کا اعلان کیا، وہ اس جلد سے بہت متاثر ہیں، اس سے پہلے اپنی قومی اسمبلی کے اجلاس میں اس کے کچھ اقتباسات پڑھ کر سنائے اور اس کا ایک ایک نسخہ اراکین کی میز پر رکھوایا، اس کے اٹھائیس ۲۸ ہزار نسخے چھپوا کر فوجیوں اور سرکاری ملازموں میں تقسیم کیے جا رہے ہیں، اس انعام کے اعلان پر خاکسار نے جناب صدر پاکستان سے مل کر مولانا ابوالحسن علی ندوی اور دارالمصنفین کی طرف سے شکریہ ادا کیا، اس کی اطلاع مولانا ابوالحسن علی ندوی کو ملی تو انھوں نے اپنی دیرینہ فراخ دلی، سیر چشمی اور بلند حوصلگی کی بنا پر یہ طے کیا کہ یہ انعام ان کے پاس پہونچا تو اس کی نصف رقم حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کی اہلیہ کو نذر کریں گے اور بقیہ دارالمصنفین کو دے دیں گے۔

صدر پاکستان کے عشائیہ میں پاکستان کے وزیر خارجہ جناب صاحبزادہ یعقوب علی خاں سے ملنے کا شرف حاصل ہوا تو ان سے یہ عرض کیا کہ ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے آپ سے یہ گذارش ہے کہ آپ اپنی وزارت خارجہ کے زمانہ میں ہندوستان و پاکستان کے تعلقات کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کریں، اسی میں ہندوستانی مسلمانوں کو خوشی ہوگی، جواب میں فرمایا کہ ہم دونوں کے تعلقات روز بروز بہتر ہو رہے ہیں، اور آیندہ بھی اچھے رہیں گے، اسی میں دونوں ملکوں کا مفاد ہے، ان کی زبان سے یہ سن کر مسرت ہوئی، یہی بات پاکستان کے وزیر اعظم سے ان کے عشائیہ میں ان سے ملتے وقت کہی، تو انھوں نے بھی اس کا اطمینان دلایا۔

جناب نبی بخش بلوچ اور ڈاکٹر معز الدین کی دعوت پر اسلام آباد میں نیشنل ہجرہ کونسل کی ایک ایسی کمیٹی میں بھی شریک ہوا جس میں اسلامی علوم و فنون پر سو عظیم ترین کتابوں کے انتخاب کا مسئلہ زیر بحث تھا، ایسی سو کتابوں کا انتخاب بحث و مباحثہ کے بعد کر لیا گیا ہے، اس کام کی تکمیل ہو گئی تو یہ پاکستان کا بہت بڑا علمی کارنامہ ہوگا، اس میں کویت کے شیخ ابو منعم رفاعی بھی شریک تھے، انھوں نے سیرۃ النبیؐ کا ترجمہ عربی میں کرنے کی ایک ضمنی تجویز پیش کی، ان کو کراچی میں پھر ملاقات ہوئی تو انھوں نے فرمایا کہ اگر اس کا ترجمہ عربی میں کر دیا جائے تو وہ اس کی طباعت کے اخراجات کا سامان کر دیں گے، عرض کی کہ پہلے تو اچھے اور اعلیٰ ترجمے کرانے کی ضرورت ہے جو عرب ممالک ہی میں ممکن ہے، ہندوستان میں اگر اس کے ترجمے عربی میں کر دیے گئے اور وہ عربوں کے معیار کے نہ ہوئے تو محنت رائگاں جائے گی۔

کراچی میں ۱۲، ۱۳ دسمبر ۱۹۸۵ء کو یوم سلیمان کی دو تقریبوں میں شرکت کرنے اور کچھ بولنے کی سعادت حاصل ہوئی، پہلی تقریب مجلس علوم اسلامیہ کی طرف سے جناب سید فخر الحسن پرنسپل لیاقت کالج کے اہتمام میں ہوئی، دوسری دلینہ ایسوسی ایشن کی طرف

سے کی گئی، دونوں وہاں کے جیسیں ہوٹل میں ہوئیں، پاکستان میں استاذی المحترم کی عقیدت اور احترام میں برابر اضافہ ہو رہا ہے، اس موقع پر مختلف اخبارات میں ان پر مضامین شایع ہوئے، ان کی صد سالہ سالگرہ کے سلسلہ میں مجلس علوم اسلامیہ کی طرف سے اور بزم سلیمان اور ویسنہ ایسوسی ایشن کی جانب سے مجلہ سلیمان شایع ہوا ہے، جس میں ان کے فضل و کمال کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ہے، ۱۰ر دسمبر کو اسی ہوٹل میں فاران کلب کی طرف سے ایک باوقار جلسہ ہوا جس میں خاکسار کو "اسلام اور مستشرقین" پر اظہار خیال کرنے کے لیے دیر تک موقع دیا گیا۔

وطن واپس ہوا تو ۲۰ر دسمبر کو غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی کی ایک شاندار تقریب میں ایوان غالب میں اس خاکسار کو بھی دس ہزار کا انعام راشٹرپتی عالی جناب گیانی ذیل سنگھ کے ہاتھوں سے ملا، اس میں انھوں نے دل کھول کر اردو کی حمایت میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ پیار کی زبان ہے، محبت کی زبان ہے، تہذیب کی زبان ہے، اس کے ذریعہ سے آزادی کی جنگ لڑی گئی، ہم اسلامی ملکوں میں گئے، یہ بولی جاتی ہے، بلکہ ہمیں بولی جاتی ہے، کسی اور زبان کو نقصان نہیں پہنچا رہی ہے، پھر اس کو اس کا جائز حق کیوں نہ ملے، وہ اپنے زبانی خطبہ میں اردو اور پنجابی کے اشعار بھی پڑھتے جاتے تھے جس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ شعر و ادب میں ان کا ذوق بہت اچھا ہے۔

اسی تقریب میں جناب شفیع قریشی سکریٹری غالب انسٹی ٹیوٹ اور سابق وزیر مملکت ریلوے محکمہ نے اپنے استقبالیہ خطبہ میں کچھ ایسی باتیں کہیں جو حیرت سے سنی گئیں، انھوں نے صدر محترم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ "آج ہمارے ملک میں ایک طبقہ کی طرف سے یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ ایکتا اور قومی یکجہتی کے نام پر یہ کہا جائے کہ سب کو ایک رنگ میں رنگ جانا چاہیے اور اس کے بعد یہ کہا جائے کہ اصلی ایکتا اور سچا رنگ وہی ہے جو پانچ ہزار سال پرانا ہے، ایکتا اور قومی یکجہتی جیسے پاک اور نہایت درجہ مفید لفظوں کا یہ نہایت نامناسب استعمال ہے، میں نے صحیح الفاظ استعمال نہیں کیے، یہ کہنا چاہیے تھا کہ یہ اعلیٰ درجہ کا منافقانہ اور عیارانہ انداز بیان ہے، پھر اس غیر ایماندارانہ کوشش کو بڑھاوا دینے کا سب سے کارگر طریقہ یہ اختیار کیا گیا کہ چونکہ کسی قوم یا علاقہ کی تہذیبی زندگی کے فروغ میں زبان کا بھی بہت بڑا حصہ ہوتا ہے، اس لیے کسی نہ کسی طرح ایسا انتظام کیا جائے کہ وہ زبان اپنی بنیادوں سے محروم ہو جائے"۔ —— اپنے جوابی خطبہ میں صدر محترم نے فرمایا کہ یہ باتیں میٹھے لہجہ میں بھی کہی جا سکتی تھیں،

اس تقریب کے بعد اسی انسٹی ٹیوٹ میں "غالب، ظفر اور ذوق" کے عنوان سے ایک بین الاقوامی سمینار ہوا جس میں خاکسار نے بھی "غالب اور ظفر کے تعلقات مہر نیم روز اور دستنبو کی روشنی میں" پیش کیا۔

مقالات

مستشرق نولدکی اور قرآن

از

مولوی محمد اویس ندوی نگرامی مرحوم سابق رفیق دارالمصنفین

"یہ پورا مضمون حضرت الاستاذ علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے افادات پر مشتمل ہے۔" (معارف)

دو مستشرقین یورپ، جن کے فضل و کمال کا سکہ دلوں پر بیٹھا ہوا، اور جن کی تلاش و تحقیق کا رعب دماغوں پر چھایا ہوا ہے، وہ اسلام کی عداوت میں کبھی ایسی عامیانہ اور جاہلانہ روش اختیار کرتے ہیں، جس پر سطحی معلومات والا انسان بھی ہنسے بغیر نہیں رہ سکتا، چنانچہ مشہور جرمن محقق و مستشرق نولدکی جس کے علمی افلاس کا یہ عالم ہے کہ وہ قرآن پاک کو (نعوذ باللہ) تصنیف محمدی بتلاتا ہے، انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں[1] قرآن مجید پر ریویو کرتے ہوئے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق لکھتا ہے، کہ عرب سے تو انھیں واقفیت تھی، لیکن بیرون عرب کا جہاں ذکر کرتے ہیں، وہاں ان کی بے خبری (لفظ کا اصلی ترجمہ جہالت ہے) کی پردہ دری ہو جاتی ہے، چنانچہ مصر کی زرخیزی کو جہاں کی بارش تقریباً نہیں دیکھی جاتی ہے، دریائے نیل کے سیلاب کے بجائے بارش پر منحصر رکھتے ہیں، واقعہ کی اصل صورت یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام جب قید خانہ میں تھے، تو مصر کے بادشاہ نے خواب دیکھا، کہ سات موٹی گائیں ہیں، اور سات دبلی، دبلی گائیں موٹی گایوں کو نگل گئیں، اور سات شاداب بالیں ہیں، اور سات خشک، خشک بالوں نے سبز بالوں کو کھا لیا، شاہ مصر کے خواب کی حضرت یوسف علیہ السلام نے تعبیر دی جس کو قرآن پاک نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

---

[1] جلد ۱۵ صفحہ ۹۰۰ طبع یازدہم کیمبرج یونیورسٹی۔

قال تزرعون سبع سنین دابا
فما حصدتم فذروہ فی سنبلہ الا
قلیلا مما تاکلون ثم یاتی من بعد
ذالک سبع شداد یاکلن ما قدمتم
لھن الا قلیلا مما تحصنون ثم یاتی
من بعد ذالک عام فیہ یغاث
الناس وفیہ یعصرون۔

(یوسف - ۶)

آپ نے فرمایا کہ تم سات سال متواتر غلہ
بوتا پھر جو فصل کاٹو اس کو بالوں میں رہنے
دینا، ہاں مگر تھوڑا سا جو تمہارے کام میں
آئے پھر اس کے بعد سات برس اور ایسے
سخت آئیں گے، جس کو تم نے ان برسوں کے
واسطے جمع کیا ہے، مگر تھوڑا سا جو تم رکھ
چھوڑ دوگے، پھر اس کے بعد ایک برس ایسا
آئے گا، جس میں لوگوں کے لیے خوب بارش
ہوگی، (یا فریاد رسی ہوگی) اور اس میں شیرہ
بھی نچوڑیں گے۔

اس تعبیر میں ایک لفظ (یغاث) ہے، جس کا مفہوم یہ لیا گیا ہے، کہ بارش ہوگی، جرمن مستشرق کے نزدیک مصر کے سلسلہ میں بارش کا ذکر نعوذ باللہ صاحب قرآن کی بے خبری کی دلیل ہے۔

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

بے خبر انسان کو خدائے علیم وخبیر کے کلام پر تنقید کی جرأت؟ ذیل کی سطروں میں اس تنقید کی اصل حقیقت آشکارا کی گئی ہے،

(۱) اس سلسلہ میں پہلی بات یہ ہے کہ (یغاث) کے معنی صرف پانی برسنے کے نہیں ہیں مفسرین کی ایک جماعت کہتی ہے، کہ یہ غیث (بمعنی بارش) سے مشتق نہیں ہے، بلکہ اس کا مادہ غوث ہے، جس کے معنی فریاد رسی کے ہیں، یعنی اس قحط کے بعد ایسا سال آئے گا، جس میں لوگوں کی فریاد رسی ہوگی اور قحط دور ہوگا اس قحط کے خاتمہ کا سبب بارش ہوگی، یا نیل کا سیلاب؟ اس کا یہاں کوئی تذکرہ نہیں ہے۔

روح المعانی[۱] میں ہے۔

ای یصیبھم غیث ای مطر کما
قال ابن عباس ومجاھد والجمھور
فھو من غاث الثلاثی الیائی
وقیل ھو من الغوث ای الفرج
یقال اغاثنا اللہ تعالیٰ اذا
امدنا برفع المکاره حین
اظلتنا فھو رباعی واوی

یعنی ان کو پانی پہنچے گا، جیسا کہ ابن عباسؓ
مجاہد اور جمہور نے کہا ہے، اس وقت
اس کا مادہ غیث ہوگا، اور کہا گیا ہے
کہ اس کا مادہ غوث ہے، یعنی فریاد رسی
اور مصیبت کا دور کرنا کہا جاتا ہے اغاثنا
اللہ جب کہ خدا ہماری مصیبتوں کو دور
کرے۔

بیضاوی[۲] میں ہے۔

یمطرون فیہ من الغیث او یغاثون
من القحط من الغوث۔

بارش ہوگی جب کہ مادہ غیث ہو اور
اگر مادہ غوث ہو تو اس کے معنی یہ ہوں گے
کہ قحط ان سے دور کیا جائے گا۔ انکی فریاد رسی ہوگی،

ثعالبی کی جواہر الحسان[۳] فی تفسیر القرآن میں ہے۔

جائز ان یکون من الغیث وھو
قول ابن عباس وجمھور المفسرین
ای یمطرون وجائز ان یکون
من اغاثھم اللہ اذا فرج عنھم
ومنہ الغوث وھو الفرج

جائز ہے کہ غیث سے ہو جیسا کہ ابن عباسؓ
اور جمہور مفسرین کا قول ہے، یعنی بارش ہوگی
اور جائز ہے کہ غوث سے ہو، جس کے معنی
فریاد رسی کے ہیں، یعنی ان کی مشکل دور
کیجائے گی،

---

[۱] جلد ۱۲ صفحہ ۲۲۹ - [۲] بیضاوی ج ۱ ص ۳۹۹ - [۳] جواہر الحسان ج ۲ ص ۲۲۱ -

(۲) اور اگر عام مفسرین کے مسلک کے مطابق بارش ہی کے معنی لیے جائیں، تو بھی فاضل مستشرق کا یہ دعویٰ کہ مصر میں بالکل بارش نہیں ہوتی ہے، غلط ہے، بارش کم سہی لیکن اس کا مطلقاً انکار خلاف واقعہ ہے۔

یعقوبی کتاب البلدان میں کہتا ہے، کہ مصر میں سواحل پر کسی قدر بارش ہوتی ہے۔[1]

الحضارۃ المصریہ[2] میں ہے، کہ یہ کہنا ہرگز صحیح نہیں ہے، کہ وادی نیل بارش سے محروم ہے۔

ای مارسڈن وٹی آسفورڈ اسمتھ کے جغرافیۂ عالم میں ہے،[3]

"بارش یہاں بہت ہی کم یعنی قاہرہ میں ایک انچ سالانہ اور اسکندریہ میں جو سمندر سے متصل واقع ہے، ۸ انچ سالانہ سے زیادہ نہیں ہوتی"۔

(۳) مصر کے وہ مقامات جہاں فراعنۂ مصر کا قیام تھا، ان کا بارانی ہونا تو بہر حال ثابت ہے، چنانچہ مصر کے سواحل اور قاہرہ جو ساحل دریائے نیل پر چودہ میل مربع رقبہ میں آباد ہے۔ وہاں بارش کا ہونا معلوم ہو چکا ہے، تاریخ سے معلوم ہوتا ہے، کہ فراعنۂ مصر کا قیام قاہرہ سے قریب ہی منف اور عین شمس میں رہا کرتا تھا، ابوالفداء کی تقویم البلدان میں ہے، کہ عین شمس کو مدینۂ فرعون کہا جاتا ہے، اور یہ قاہرہ سے نصف مرحلہ پر واقع ہے۔[4]

یاقوت نے معجم البلدان میں منف کو فرعون کا شہر بتلایا ہے، اور یہاں کے آثار قدیمہ کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ یہیں حضرت یوسف علیہ السّلام کا مکان تھا یہیں فرعون کا قیام بھی رہا کرتا تھا، اور یہیں فرعون کا عین شمس تھا، اور اس وقت فسطاط کا جو محل وقوع ہے، وہ عین شمس اور منف کے درمیان ہے۔[5]

اصل یہ ہے کہ عین شمس ایک ہیکل تھا، لوگ اس کی زیارت کو آتے تھے، پھر یہاں آبادی قائم ہو گئی۔

---

[1] کتاب البلدان، صفحہ ۳۳۰ [2] الحضارۃ المصریہ صفحہ ۸ [3] جغرافیۂ عالم ج ۲ ص ۶۳ حیدرآباد [4] تقویم البلدان ص ۱۱۸ [5] معجم البلدان ج ۴ ص ۱۸۱

اور رفتہ رفتہ اس آبادی نے شہر کی حیثیت اختیار کر لی، ورنہ یہ منف سے الگ نہیں ہے،[1]

خطط مقریزی میں ہے کہ حضرت یوسف علیہ السّلام نے حضرت یعقوب علیہ السّلام اور پورے خاندان کو جس میں ۷۳ مرد اور عورتیں شامل تھیں، فرما اور عین شمس کے درمیان ٹھہرایا تھا، اور یہاں کی زمین بہت شاداب ہے۔[2]

اب بھی عین شمس قاہرہ کے مضافات میں موجود ہے مسلمان اس کو عون اور یورپی لوگ ہیلیوپوس کے نام سے یاد کرتے ہیں، اب یہاں بڑے بڑے مکانات اور شاندار ہوٹل ہیں، قاضی ولی محمد صاحب اپنے سفرنامہ مصر ۱۹۲۴ء میں لکھتے ہیں۔

"کہتے ہیں کہ اس جگہ کو حضرت موسیٰ کی اقامت گاہ کا شرف حاصل ہوا تھا، اور فرعون کا محل بھی یہیں کہیں تھا، اور یہیں عزیز مصر کے بنگلہ میں زلیخا رہتی تھی، اس جگہ ہیکل شمسی تھا، جہاں آفتاب پرستی ہوتی تھی"۔[3]

ان تفصیلات سے معلوم یہ ہوا کہ فراعنۂ مصر قاہرہ کے قریب ہی آباد تھے، اور وہاں بارش ہوتی تھی، اس لیے حضرت یوسف علیہ السّلام کی تعبیر خواب میں اگر بارش کا ذکر تسلیم کیا جائے، تو یہ کوئی خلاف واقعہ بات نہیں ہے۔

(۴) محقق مستشرق نے مصر کی زرخیزی کو دریائے نیل پر منحصر رکھا ہے، لیکن اس پر غور نہیں کیا، کہ خود دریائے نیل کا پانی بھی بارش ہی کے پانی کا نتیجہ ہے۔

یعقوبی کا بیان ہے کہ مصر اور اس کے دیہاتوں کا کام نیل سے چلتا ہے، اور نیل کے پانی میں بارش کے اس پانی سے زیادتی ہوتی ہے، جو گرمی میں برستا ہے۔

الحضارۃ المصریہ میں ہے۔

---

[1] مقریزی ج ۱ ص ۳۱۸ [2] ایضاً ج ۱ ص ۳۹۷ [3] سفرنامہ مصر قاضی ولی محمد۔ ص ۱۱۴۔

اب یہ بات بالکل واضح ہو چکی ہے، کہ نیل کا فیضان اس بارش کا نتیجہ ہوتا ہے جو بیچ بیچ وسط افریقہ میں ہوتی ہے جہاں کہ دریائے نیل کا منبع ہے، اور وہاں سے مصر کی طرف یہ پانی سرسبزی اور شادابی لے کر آتا ہے[1]۔

عہد حاضر کے مشہور عالم علامہ سید رشید رضا مرحوم جن کی پوری زندگی تقریباً مصر ہی میں گذری وہ اپنی تفسیر میں[2] فرماتے ہیں کہ مصر کو بارش کے پانی سے مستثنیٰ نہیں کیا جا سکتا ہے، کہا جاتا ہے، کہ مصر کی زندگی بارش سے نہیں بلکہ نیل کے پانی سے ہے، حالانکہ خود نیل کا پانی بارش ہی کا ممنون ہے، نیل کا فیضان اور اس کی کمی درحقیقت ان مقامات کی بارش پر منحصر ہے، جہاں سے نیل میں پانی آتا ہے، اس ضمن میں علامہ مرحوم نے قرآن پاک کی یہ آیت نقل فرمائی ہے۔

انزل من السماء ماءً فسلکہ ینابیع	اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی برسایا پھر
فی الارض ۔ (زمر ۔ ۲)	اس کو زمین کے سوتوں میں داخل کر دیتا ہے۔

اس کے بعد فرمایا کہ چھوٹے دریا جو نیل کے ینابیع ہیں، وہ بارش ہی کے پانی سے ہیں۔

یہاں فرعون کا وہ مقولہ بھی پیش نظر رکھنا چاہیے، جس کو قرآن پاک نے نقل فرمایا ہے۔

الیس لی ملک مصر وھذہ	اے میری قوم کیا مصر کی سلطنت میری
الانھار تجری من تحتی	نہیں ہے، اور یہ نہریں میری پائیں میں
(زخرف ـ ۵)	بہ رہی ہیں۔

اس سلسلہ میں قرآن پاک کی ایک دوسری آیت بھی قابل توجہ ہے، قرآن مجید میں اللہ تبارک تعالیٰ نے اپنی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ بھی بتائی ہے، کہ ہم ان مقامات پر پانی پہنچاتے ہیں، جہاں بارش نہیں ہوتی ہے، یا اگر ہوتی ہے، تو اس قدر کم کہ اس سے پورا نفع نہیں اٹھایا جا سکتا ہے، فرمایا

---

[1] الحضارۃ المصریہ ص ۸ [2] جلد ۲ ص ۲۵۔

اولم یروا انا نسوق الماء الی	کیا انھوں نے اس بات
الارض الجرز فنخرج بہ زرعاً	پر نظر نہیں کی کہ ہم خشک افتادہ
کل منہ انعامھم وانفسھم	زمین کی طرف پانی پہنچاتے ہیں، پھر اس کے
افلا یبصرون ۔	ذریعہ سے کھیتی پیدا کرتے ہیں جس سے انکے
(سجدہ ـ ۳)	مواشی اور وہ خود بھی کھاتے ہیں تو کیا
	دیکھتے نہیں ہیں۔

مفسر ابن جریر نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے "ارض جرز" کے یہ معنی نقل کیے ہیں۔

قال الجرز التی لا تمطر الا مطراً	جرز وہ ہے، جہاں ناکافی بارش ہوتی ہو
لا یغنی عنھا شیئاً الا ما یاتیھا من	سوا اس کے کہ جو پانی سیلاب سے پہنچ جائے
السیول[1]۔	

حافظ سیوطی حسن المحاضرہ[2] میں کہتے ہیں، کہ ایک جماعت کے نزدیک ارض جرز سے مراد مصر کی سرزمین ہے، حافظ ابن کثیر اپنی تفسیر[3] میں فرماتے ہیں، کہ مفسرین عموماً "ارض جرز" کے لیے مثال میں مصر کا نام پیش کر دیتے ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے، کہ اس سے مراد محض "مصر" ہے، بلکہ ارض جرز میں مصر بھی ہے، مصر کا "ارض جرز" میں ہونا قطعی ہے، وہاں کی زمین کی حالت یہ ہو کہ اگر بارش حسب ضرورت ہو تو مکانات منہدم ہو جائیں، اس لیے اللہ تعالیٰ وہاں بارش کے بجائے اس پانی کو لیجاتے ہیں، جو بلاد حبشہ میں برستا ہے،

اسی مفہوم کو شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے اپنے رسالہ عرشیہ[4] اور منہاج السنہ میں بیان کیا ہے[5]۔ منہاج السنہ میں ابن تیمیہ کے الفاظ یہ ہیں۔

---

[1] تفسیر ابن جریر ج ۱ ص ۶۲ [2] ج ۱ ص ۴ [3] ج ۳ ص ۴۴۲ [4] ص ۱۳ [5] ج ۳ ص ۱۱

فالارض الجرز لاتمطر ما یکفیھا	ارض جرز میں اتنا پانی نہیں برستا ہے، جو اس کیلئے
کارض مصر لو امطرت مطر	کافی ہو جیسے مصر کی زمین کہ اگر معمولی بارش
المعتاد لم یکفھا فانھا ارض	ہو، تو وہ اس کو کافی نہیں، اس لیے کہ مصر
ابلیز وان امطرت مطر	کی زمین کیچڑ والی ہے، اور اگر زیادہ
کثیرا مثل مطر شھر (اذار)	پانی برسے (مثلاً جتنی بارش کہ مارچ میں
خربت المساکن فکان من	ہوتی ہے) تو مکانات برباد ہو جائیں اسی
حکمۃ الباری ورحمتہ ان	خدا کی حکمت اور رحمت ہے، کہ ایک
امطر ارضاً بعیدۃ ثم ساق	دور مقام پر پانی برساتا ہے، پھر اس
ذالک الماء الی ارض مصر	پانی کو مصر لے جاتا ہے، اس آیت
فھذہ الایۃ یستدل بھا	سے خدا کے علم، اس کی قدرت، اس کی
علی علم الخالق وقدرتہ	مشیت اور اس کی حکمت پر استدلال
ومشیتہ وحکمتہ	کیا جاسکتا ہے۔

کس قدر دلچسپ بات ہے کہ جو چیز نولدکی کے نزدیک نعوذ باللہ صاحبِ قرآن کی بے خبری پر دلالت کرتی ہے، شیخ الاسلام ابن تیمیہ اسی سے خدا کے علم، اس کی قدرت اس کی مشیت اور اس کی حکمت پر استدلال کرتے ہیں۔ یہ امر بھی خاص طور سے لائق توجہ ہے، کہ یہ قحط مصر ہی میں نہ تھا، بلکہ اس کے اثرات دور دور تک تھے، برادران یوسف علیہ السّلام کا غلہ کے لیے مصر آنا خود قرآن میں مذکور رہے، تورات میں بھی ان کا کنعان سے مصر تک غلہ کے لیے آنا مصرح موجود ہے[۱]، نہ صرف کنعان بلکہ اور بہت سے ملکوں کے لوگ غلہ کے لیے مصر آتے تھے[۲]۔

۱؎ پیدائش باب ۴۲　　۲؎ پیدائش باب ۴۱۔

عرب کے جنوبی علاقہ یمن تک اس کے اثرات تاریخ سے ثابت ہیں، چنانچہ ریورنڈ فارسٹر کے انگریزی "تاریخی جغرافیۂ عرب" میں[۳]۔ ابن ہشام کے حوالہ سے درج ہے، کہ ملک یمن میں سیلاب کے اثر سے ایک قبر کھل گئی، جس میں ایک عورت کی لاش نظر آئی، اس کے گلے میں موتیوں کے سات گلوبند، ہاتھوں اور پیروں میں بازوبند، کڑے اور سات سات چھڑے بھی تھے، ہر ہر انگلی میں نگینہ کی بیش قیمت انگوٹھی تھی، سرہانے زر و مال سے لبریز ایک صندوقچہ تھا، قبر میں ایک کتبہ بھی ملا جس میں پہلے فقرہ کے بعد پانچ اشعار درج ہیں، اس کی نقل حسب ذیل ہے۔

	باسمک اللّٰھم الہ حمیر	تیرے نام ع اے خدا اے حمیر
(۱)	انا تاجہ بنت ذی شفر بعثت ما	میں تاجہ بنت ذی شفر ہوں، میں نے
	یرنا الی یوسف فابطأ علینا فبعثت	اپنے شاہی داروغہ کو یوسف کے
	لاذتی۔	پاس بھیجا، پھر جب واپسی میں دیر
		ہوئی، تو میں نے اپنی خواص کو بھیجا،
(۲)	بمد من ورق لتاتینی بمد من طحین	چاندی کی ایک مقدار دے کر کہ اس
	فلم تجدہ فبعثت بمد من ذھب	کے عوض میں آٹے کی ایک مقدار لائے،
		پھر جب وہ نہ مل سکا، تو پھر میں نے
		سونا دے کر بھیجا۔
	فلم تجدہ فبعثت بمد من بحری	جب اس سے بھی نہ مل سکا، تو پھر میں
(۳)	فلم تجدہ فامرت بہ فطحن	نے موتی بھیجے اور جب اس سے بھی نہ مل سکا،
		تو میں نے ان موتیوں کو پسوا ڈالا۔

۱؎ پیدائش باب ۴۲۔

فلم انتفع بہ فاقتفلت فمن — وہ کسی کام نہ آسکے، سو اب میں یہاں

سمع فلیرحمنی — دفن ہوتی ہوں، جو کوئی میری خبر پائے

اوسے چاہیے کہ میرے اوپر ترس کھائے۔

وأیۃ امرأۃ لبست حلیا من حلیتی — اور اگر کوئی عورت میرے زیوروں پر

فلاماتت الامیتتی۔ (۵) — ملبح کرے اور انھیں پہننا چاہیے تو اس کو

میری ہی جیسی موت نصیب ہو۔

اس کتبہ سے معلوم ہوا کہ یمن تک اس قحط کے اثرات یقینی تھے، توراۃ تو صراحۃً اس کی عالمگیری کی قائل ہے۔

(۵۳) اور سات برس ارزانی کے جو زمین مصر میں تھے، آخر ہوئے، اور گرانی کے سات برس جیسا کہ یوسف نے کہا تھا، آنے شروع ہوئے، (۵۴) اور سب زمین میں گرانی ہوئی، پر ہنوز مصر کی ساری زمین میں روٹی تھی، (۵۵) پر جب ساری زمین مصر بھوک سے ہلاک ہونے لگی تو خلق روٹی کے لیے فرعون کے آگے چلائی، فرعون نے سب مصریوں کو کہا کہ یوسف کنے جاؤ، وہ جو تمھیں کہے سو کرو، (۵۶) اور تمام روئے زمین پر کال تھا، اور یوسف نے ذخیرے کے کھتے کھول کے مصریوں کے ہاتھ بیچے، اور مصر کی زمین کال بہت بڑھا، (۵۷) اور سارے ملک مصر میں یوسف کنے مول لینے آئے، کیونکہ سب ملکوں میں سخت کال تھا۔[۱]

ان حوالہ جات سے بیرونِ مصر قحط کے اثرات کا جب ثبوت موجود ہے، تو مسئلہ اور واضح ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ اگر مصر کو بارش سے محروم تسلیم بھی کر لیا جائے، تو سارا عالم تو بارش سے محروم

---

[۱] پیدائش باب ۴۱۔

نہ تھا، اور قرآن پاک میں (یغاث) کے ساتھ (الناس لوگ) کا لفظ ہے، صرف اہل مصر کی تخصیص نہیں ہے۔

(۷) اس موقع پر نفس آیت پر بھی ایک نظر ڈالنا چاہیے، اور قرآن پر تنقید کے بجائے، اس کے اعجاز و بلاغت اور اس کی صداقت کا اعتراف کرنا چاہیے۔

توراۃ کی منقولہ بالا آیات سے معلوم ہو چکا ہے، کہ جب سارے عالم میں لوگ بھوک سے پریشان تھے، اس وقت مصر میں خوشحالی تھی، آیت یہ ہے۔

"اور سب زمین میں گرانی ہوئی، پر ہنوز مصر کی ساری زمین میں روٹی تھی۔"

یہ خوشحالی درحقیقت حضرت یوسف علیہ السلام کی تعبیرِ خواب کے طفیل میں تھی، جس میں آپ نے ارشاد فرمایا تھا۔

تزرعون سبع سنین دابا — تم سات سال متواتر غلہ بونا

فما حصدتم فذروہ — پھر جو فصل کاٹو اس کو بالوں میں

فی سنبلہ الا قلیلا مما — رہنے دینا، مگر تھوڑا سا جو تمھارے

تاکلون (یوسف - ۷) — کھانے میں آئے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی اس تنبیہ کے باعث اہل مصر کو کسی قدر غلہ مل گیا تھا، اور دوسرے ملکوں والے چونکہ بالکل بے خبر تھے، اس لیے وہ کوئی انتظام نہ کر سکے۔

اب قابل غور امر یہ ہے کہ اس پوری آیت میں (یغاث۔ فریاد رسی ہوگی۔ یا بارش ہوگی) اور یعصرون (شیرہ نچوڑیں گے) کے سوا جتنے صیغے ہیں، وہ سب حاضر کے ہیں، (تزرعون تم غلہ بونا) حصدتم (تم فصل کاٹو) تاکلون (تم کھاؤ) تحصنون (تم جمع کر دگے) گویا ان مخاطب صیغوں کا تعلق صرف اہل مصر سے ہے، اور اسی لیے وہ نسبتہً نفع بیں لبے،

اور ان کے بعد جو صیغے ہیں، یعنی (یغاث) اور (یعصرون) وہ غائب کے صیغے ہیں۔ یہ التفات[1] بے سبب نہیں ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ بارش یا فریاد رسی کا تعلق چونکہ دوسرے ملکوں سے بھی تھا، اس لیے یہاں غائب کے صیغے استعمال کیے گئے، تاکہ مفہوم میں عموم پیدا ہو، اور نولدکی جیسے محققین کو یہ شبہ نہ پیدا ہو، کہ مصر کی زمین تو بارانی نہیں ہے اس لیے وہاں بارش کیسے ہو سکتی ہے، اور کاشت نیز غلہ کے جمع کرنے کا تعلق چونکہ صرف اہل مصر سے تھا، اسی لیے وہاں خطاب کے صیغے استعمال کیے گیے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

---

[1] التفات علم معانی و بیان کی ایک اصطلاح ہے، جس کا مفہوم یہ ہے، کہ ایک ہی ضمن کی گفتگو میں صیغوں اور طرز خطاب کا تغیر و تبدل مثلاً ابھی گفتگو میں حاضر کے صیغے استعمال ہو رہے تھے، یکایک غائب یا متکلم کے صیغے استعمال ہونے لگے، ابھی ماضی کا استعمال تھا، کہ مضارع کا استعمال ہونے لگا۔ وغیر ذالک یہ علم بلاغت کا ایک اہم شعبہ ہے، اور قرآن پاک کے التفات میں بے انتہا نکات ہیں، جو علم بلاغت سے دلچسپی رکھنے والوں پر پوشیدہ نہیں ہیں۔

اسلام اور مستشرقین جلد پنجم

یہ دارالمصنفین کے اہم اور نئے سلسلۂ تالیفات کی، جس کے پانچ حصے اب تک شائع ہو چکے ہیں، پانچویں جلد ہے۔ جس میں اسلامی علوم و فنون سے متعلق مستشرقین کی قابل قدر خدمات کے اعتراف کے بعد ان کے اسلام، شارع اسلام، تاریخ اسلام پر اعتراضات کے جواب میں سید صاحب علیہ الرحمۃ کے وہ تمام مضامین جمع کر دیئے گئے ہیں جو انھوں نے الندوہ لکھنؤ، الہلال کلکتہ، معارف اعظم گڑھ میں لکھے تھے، مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن قیمت ۱۵ روپیہ

سیرتِ عائشہؓ

از

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

یہ استاذی المحترم حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کی بڑی مشہور تصنیف ہے جو ۱۹۲۰ء میں شائع ہوئی، جب کہ حضرت سید صاحبؒ کی عمر ۳۶ برس کی تھی مگر اسکے پڑھنے سے یہ اثر ہوتا ہے کہ کسی معمر، کہنہ مشق اور دیدہ ور مصنف کی لکھی ہوئی ہے، اس کی اہمیت کا صحیح اندازہ اس وقت ہوگا جب اس کا مطالعہ اس ناقدانہ نظر سے کیا جائے کہ اس کا ماخذ کیا ہے، اور تحقیق کے پایہ کے لحاظ سے اس کا درجہ کیا رکھا جا سکتا ہے، یہ ایک سوانح حیات ہے، تو سوانح نگاری کے فن کے اعلیٰ معیار پر اگر جانچی جائے تو کہاں تک اس پر پوری اترتی ہے، پھر اس کا اسلوب، انداز بیان اور زبان بیسویں صدی کے ذہن کو مطمئن کر سکتی ہے یا نہیں ؟ یا محض اس کو حسن عقیدت کا ایک نذرانہ سمجھا جائے۔

ماخذ کی تصریح حضرت سید صاحبؒ نے اس کے دیباچہ میں خود ہی کر دی ہے، وہ رقمطراز ہیں کہ سوانح عمریوں کے لیے عموماً تاریخ کی کتابیں کار آمد ہوتی ہیں، لیکن اس سوانح عمری کے قلمبند کرنے میں تاریخی کتابوں کا سہارا نہیں لیا گیا ہے، اس زمانہ کی کوئی معاصر تاریخ قلمبند بھی نہیں ہوئی، احادیث نبویؐ کو لوگ عقائد اور مسئلہ مسائل کے سلسلہ میں زیادہ تر استعمال کرتے رہے ہیں، مگر حضرت سید صاحبؒ نے ان ہی احادیث نبویؐ کو تاریخ بنا دیا ہے اور ان ہی کے سہارے یہ سوانح عمری ایسی مرتب ہو گئی ہے کہ جو بے شمار تاریخی کتابوں کے ذریعہ سے نہیں لکھی جا سکتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، امہات المومنینؓ اور صحابۂ کبارؓ کی جو زندگیاں رہیں وہ حضرت

سید صاحبؒ کی نظر میں علمی تاریخ ہے، اس بنا پر ان کی معلومات کا ماخذ صرف احادیث کی کتابیں ہیں، ان کا بیان ہے کہ جوامع، مسانید اور سنن سے عموماً اور کہیں کہیں اسماء الرجال کی کتابوں مثلاً طبقات ابن سعد، تذکرۃ الحفاظ ذہبی، تہذیب ابن حجر، پھر فتح الباری، قسطلانی، نووی اور دوسری شروح حدیث سے بھی مدد لی گئی ہے، بڑی شان استغنا کے ساتھ رقمطراز ہیں کہ تاریخ کی کتابوں کو ہاتھ تک نہیں لگایا ہے، جنگ جمل کے متعلق بے شبہہ مجبوری تھی، کیونکہ اس کا تعلق احادیث نبویؐ سے نہیں، اس لیے اس باب میں زیادہ تر تاریخ طبری پر اعتماد کیا ہے۔

مگر طبری یا کسی اور مورخ کی روایت کی چھان بین بہت احتیاط سے کی ہے، مثلاً ایک روایت یہ بیان کی جاتی ہے کہ حضرت امام حسنؓ نے اپنے بھائی کو وصیت کی تھی کہ ان کی لاش اسی خالی جگہ پر دفن کی جائے جہاں ان کے نانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جسد مبارک دفن ہے، اگر اس میں کوئی مزاحم ہو تو جنگ و جدل کی ضرورت نہیں، حضرت عائشہؓ نے خوشی سے اس کی اجازت دے دی، مگر جب حضرت امام حسنؓ کی وفات ہوئی تو مروان بن حکم نے اس کی مخالفت یہ کہہ کر کی کہ جب یہاں عثمانؓ کو باغیوں نے دفن ہونے نہیں دیا تو کسی اور کو بھی اجازت نہیں ہو سکتی، یہ اختلاف اتنا بڑھا کہ بنو ہاشم اور بنو امیہ باضابطہ جنگ کے لیے تیار ہو گئے، تو حضرت امام حسینؓ نے ان کو ان کی والدہ کے پہلو میں جنۃ البقیع میں دفن کیا، اس طرح بھائی کی وصیت پوری کی کہ کوئی مزاحم ہو تو جنگ و جدل کی ضرورت نہیں، اب سوال یہ ہے کہ اس معاملہ میں حضرت عائشہؓ کا طرز عمل کیا تھا، اس کا تجزیہ کرتے ہوئے حضرت سید صاحبؒ لکھتے ہیں کہ بعض شیعی مورخوں نے لکھا ہے کہ حضرت عائشہؓ کچھ سپاہیوں کے ساتھ سپید خچر پر سوار ہو کر حضرت امام حسنؓ کے جنازے کے ساتھ نکلیں، سپاہیوں نے تیر چلائے، اتنے میں حضرت عائشہؓ کے بھائی آئے اور انھوں نے کہا: ابھی جنگ جمل کی شرم ہمارے خاندان سے مٹی نہیں کہ تم ایک اور جنگ کے لیے آمادہ ہو، یہ سن کر حضرت عائشہؓ واپس چلی گئیں، اتنا لکھ کر سید صاحبؒ رقمطراز ہیں کہ یہ روایت تاریخ طبری کے ایک پرانے فارسی ترجمہ میں نظر سے گذری ہے، جو ہندوستان میں چھپ بھی گیا ہے، لیکن جب اصل متن عربی مطبوعہ یورپ کی طرف رجوع کیا تو جلد ہفتم کا ایک ایک حرف

پڑھنے کے بعد بھی یہ واقعہ نہ ملا، طبری کے اس فارسی ترجمہ میں درحقیقت بہت سے حذف اور اضافے ہیں، مترجم نے مقدمہ میں اس کی تصریح بھی کر دی ہے، اس کے بعد حضرت سید صاحبؒ لکھتے ہیں کہ یعقوبی تیسری صدی کا شیعی مورخ ہے، اس نے بھی یہ واقعہ نقل کیا ہے، لیکن اس کی وہ سند نہیں لکھا، اس کے علاوہ یہ بھی لکھ گیا ہے کہ درحقیقت مروان کا فعل تھا، اس طرح وہ قیل یعنی ضعیف روایت کے صیغہ کے ساتھ اس کا ذکر کر گیا ہے، لیکن یہ نہیں لکھتا ہے کہ انھوں نے تیر چلائے اور جنگ کی۔

اسی طرح حضرت سید صاحبؒ نے اس سلسلہ میں ابوالفداء کی روایت کی بھی تکذیب کی ہے، جس نے لکھا ہے کہ بنو ہاشم اور بنو امیہ میں جنگ و جدال شروع ہو گیا تو حضرت عائشہؓ نے کہلا بھیجا کہ یہ گھر میری ملکیت ہے، میں کسی اور کو یہاں دفن ہونے کی اجازت نہیں دیتی، سید صاحبؒ اس پر تبصرہ کرتے ہیں کہ یہ بھی صحیح نہیں، ابن اثیر اور تمام معتبر تاریخوں میں مذکور ہے کہ ام المومنینؓ نے بطیب خاطر اجازت دے دی تھی، امیر معاویہؓ کی طرف سے جو گورنر مدینہ میں تھا، اس نے بھی نہیں روکا، لیکن مروان چند آدمیوں کو لے کر فساد پر آمادہ ہو گیا تو امام حسینؓ کو اس شرارت پر بہت غصہ آیا، تاہم بھائی کی وصیت سے انحراف نہ کرنا چاہا، حضرت سید صاحبؒ نے اس کی تائید عبدالبر کی الاستیعاب، ابن اثیر کی اسد الغابہ اور سیوطی کی تاریخ الخلفاء سے بھی کی ہے، (ص ۱۴۳-۱۴۱) حضرت سید صاحبؒ نے تاریخی روایتوں کی چھان بین جس طرح کی ہے، اس کا اندازہ اس تجزیہ سے ہوگا۔

حضرت سید صاحبؒ نے سیرت عائشہؓ کی تدوین کے سلسلہ میں صحیح بخاری، صحیح مسلم، ابوداؤد اور مسند امام احمدؒ بن حنبل کو بھی اپنے مطالعہ میں رکھا ہے، ان کا بیان ہے کہ ان کتابوں کا ایک ایک حرف پڑھا، مسند احمد کی چھٹی جلد میں حضرت عائشہؓ کے مرویات میں ان کے حالات بکثرت ہیں، حاکم کی مستدرک اور سیوطی کی عین الاصابہ فی استدراک عائشہ علی الصحابہ سے بھی نادر معلومات حاصل کیے، لکھتے ہیں کہ عین الاصابہ ایک مختصر رسالہ ہے، مگر اس میں وہ حدیثیں جمع کی گئی ہیں جن میں حضرت عائشہؓ نے اپنے

معاصرین کی غلطیاں یا غلط فہمیاں ظاہر کی ہیں، یہ بھی لکھتے ہیں کہ بخاری میں حالات بہت متفرق اور منتشر تھے، لیکن ان کو ڈھونڈ کر اس طرح یکجا کیا ہے جس طرح چیونٹیوں کے منھ سے شکر کے دانے کوئی چنے، بلکہ ان کے اس بیان میں یہ اضافہ کر دیا جائے تو زیادہ صحیح ہوگا کہ چیونٹیوں کے منھ سے شکر کے دانے چن چن کر جس طرح کوئی لذیذ مٹھائی تیار کرے اسی طرح انھوں نے احادیث خصوصاً بخاری کے متفرق اور منتشر معلومات کو یکجا جمع کیا ہے، بلکہ حضرت عائشہؓ کے سوانح کی مٹھائیوں کا ایک دسترخوان بچھا دیا ہے، اس کتاب میں جس طرح حوالے دیے ہیں، اس کی تصریح بھی یہ لکھ کر کر دی ہے کہ ایک ہی واقعہ حدیث کی مختلف کتابوں میں ایک ہی کتاب کے مختلف ابواب میں مذکور ہوتا ہے، اس لیے جہاں کہیں کسی کتاب، یا باب کا حوالہ دیا ہے اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ واقعہ حدیث کی دوسری کتابوں یا دوسرے ابواب میں نہیں ہے، بلکہ جہاں جو حوالہ مناسب سمجھا گیا دے دیا گیا ہے، کہیں کہیں ایک ہی واقعہ کے مختلف حوالے ہیں، کوئی واقعہ بغیر حوالہ کے نہیں لکھا گیا ہے، اس لیے شروع سے آخر تک اس میں اتنے حوالے ہیں کہ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ کسی عربی مدرسہ کے ایک فارغ التحصیل عالم کی لکھی ہوئی ہے، بلکہ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جس طرح کسی یونیورسٹی کا ایک ماہر تحقیق حوالوں کی پوری پابندی کے ساتھ کوئی محققانہ کتاب لکھتا ہے اسی طرح یہ سیرت لکھی گئی ہے، جس کو پڑھ کر بیسویں صدی کا ذہن پوری طرح مطمئن ہو سکتا ہے۔

احادیث نبویؐ کے سہارے یہ سوانح عمری مرتب ہوئی ہے تو یہ احادیث نبویؐ کا ایک گلکدہ بھی ہے اور سوانح عمری کا ایک چمنستان بھی۔

پھر اس کا تحقیقی پایہ اس طرح بلند ہو جاتا ہے کہ ہر روایت کو اصول درایت سے پرکھا گیا ہے، حضرت سید صاحبؒ نے درایت کے سلسلہ میں حضرت عائشہؓ کے اس اصول کو بڑی اہمیت دی ہے کہ روایت کلام الٰہی کے مخالف نہ ہو، (ص ۱۸۷) انھوں نے درایت کے اس اصول کو اپنی ہر تحریر اور تصنیف میں پیش نظر رکھا، سیرت عائشہؓ میں بکثرت حدیث کی ایسی روایتوں کو رد کیا ہے جو ان کے اصول درایت پر پوری نہیں

اترتی تھیں اور ضعیف تھیں، انھوں نے جن ضعیف حدیثوں کو رد کیا ہے ان سے گذشتہ ۶۵ سال میں علمائے صالحین کو کوئی اختلاف نہیں ہوا، جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ کتاب پوری تحقیق کے ساتھ لکھی گئی ہے، البتہ حضرت عائشہؓ کی شادی کے وقت ان کی جو عمر سید صاحبؒ نے لکھی ہے، وہ ضرور متنازع فیہ بن گئی ہے، سید صاحبؒ لکھتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ کا جب نکاح ہوا تو اس وقت وہ چھ[۶] برس کی تھیں، رخصتی کے وقت ان کی عمر نو[۹] سال کی تھی، اس کمسنی کی شادی پر سید صاحبؒ تبصرہ کرتے ہیں کہ بعض بے احتیاط لوگوں نے اس خیال سے کہ کم سنی کی یہ شادی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے موزوں نہیں، اس بات کی کوشش کی ہے کہ وہ ثابت کریں کہ اس وقت ان کی عمر چھ برس کے بجائے سولہ[۱۶] برس کی تھی، لیکن یہ کوشش تمام تر بے سود اور ان کا یہ دعویٰ بالکل بے دلیل ہے، حدیث و تاریخ کے پورے دفتر میں ایک حرف بھی ان کی تائید میں موجود نہیں، جس کو تفصیل درکار ہو وہ معارف (جولائی ۱۹۲۸ء اور جنوری ۱۹۲۹ء) میں اس بحث کو دیکھے، (ص ۱۲) سید صاحبؒ اس کے قائل آخر آخر وقت تک رہے، ان کا خیال ہے کہ جس طرح حضرت عائشہؓ اپنی ذکاوت، جودت، ذہانت اور نکتہ رسی میں غیر معمولی تھیں، اسی طرح ان کی جسمانی نشو و نما اور بالیدگی بھی غیر معمولی تھی، (ص ۱۳) نو دس برس کی سن میں وہ اچھی خاصی بالغ ہوگئی تھیں (ص ۱۴۸)

پھر جہاں تک سوانح نگاری کے فن کا تعلق ہے، اس کے معیار پر یہ کتاب پوری اترتی ہے، حضرت عائشہؓ کی ولادت، بچپن، شادی، ہجرت، رخصتی، تعلیم، تربیت، خانہ داری، گھر کا نقشہ، فقر و فاقہ، باورچی خانہ، شوہر سے محبت، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی غیر معمولی محبت، پیار کا ناز، خدمت گذاری، سوکنوں کے ساتھ برتاؤ، سوتیلی اولاد سے محبت بھرے تعلقات، واقعۂ افک اور بیوگی کی اتنی جزوی تفصیلات اس میں آگئی ہیں کہ شاید اس سے زیادہ قلمبند کرنا کسی اور کے لیے ممکن نہیں، پھر روزمرہ زندگی کے واقعات کے ساتھ حضرت عائشہؓ کی سیرت میں ان کی قناعت پسندی، ہمجنسوں کی امداد، خودستائی سے پرہیز، خودداری، انصاف پسندی، دلیری، فیاضی، خشیت الٰہی، رقیق القلبی، عبادت الٰہی اور غلاموں کی

شفقت کی جو مرقع آرائی کی گئی ہے، اس کو پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک مصور اپنی مصوری میں موئے قلم سے طرح طرح کے رنگ بھر کر اس کو دیدہ زیب اور جاذب نظر بنا رہا ہے۔

حضرت عائشہؓ کی زندگی میں واقعۂ افک اور جنگ جمل دو عجیب وغریب واقعات گذرے ہیں، عیب جو اور نکتہ چین اہل قلم کو ان دونوں واقعات کی تفصیلات لکھنے میں بہت کچھ حاشیہ آرائی کرنے کا موقع ہے، مگر سید صاحبؒ نے ان کو ایسے موثر انداز میں پیش کیا ہے کہ اس کی تاثیر سے متاثر ہوئے بغیر ناظرین نہیں رہ سکتے۔

یہ مشہور واقعہ ہے کہ حضرت عائشہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بنی مصطلق کی معرکہ آرائی میں تھیں، جب اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واپس ہو رہے تھے تو حضرت عائشہؓ قافلہ میں پیچھے چھوٹ گئیں، پڑاؤ پر چادر اوڑھ کر پڑ رہیں کہ جب لوگ محمل میں نہ پائیں گے تو خود لینے آئیں گے، صفوانؓ بن معطل ایک صحابی قافلہ کے پیچھے پیچھے گری پڑی چیزوں کا انتظام کرتے ہوئے آرہے تھے، انھوں نے حضرت عائشہؓ کو دیکھا تو اناللہ پڑھا، پھر اپنے اونٹ پر بٹھایا، صفوانؓ کے ہاتھ میں اونٹ کی مہار تھی، اور وہ محمل پر سوار تھیں، اس طرح وہ قافلہ سے آملیں، یہ معمولی واقعہ تھا، مگر حضرت سید صاحبؒ لکھتے ہیں کہ ہندوؤں میں سیتا پر اور بنی اسرائیل میں حضرت مریمؑ پر جو کچھ گذری، اسلام میں اسی کا اعادہ ہوا، یعنی منافقوں نے حضرت عائشہؓ کی پاکدامنی پر الزام رکھ دیا، عبداللہ ابن ابی، حسان بن ثابتؓ شاعر اور مسطح بن اثاثہ نے اس سازش میں جو حصہ لیا، اس کا ذکر کرنے کے بعد وہ رقمطراز ہیں کہ:

"دنیا میں عزت سے زیادہ کوئی چیز نازک نہیں، یہ وہ شیشہ ہے جو پتھر پھینکنے سے نہیں، بلکہ پتھر پھینکنے کے ارادہ سے بھی چور چور ہو جاتا ہے، غلط بات بھی جب کسی آبرودار اور نیک آدمی کی نسبت کوئی شریر کہہ بیٹھتا ہے تو وہ شرم سے پانی پانی ہو جاتا ہے، یا غصہ سے آگ بگولہ ہو جاتا ہے، اب تک ناصرۂ اسلام کی مریم ان واقعات سے بے خبر تھی!"

اور جب ان کو معلوم ہوا تو سید صاحبؒ نے پوری تفصیل لکھی ہے کہ کس طرح غش کھا کر گر پڑیں، والدین نے سنبھالا، شدت کا بخار اور لرزہ آگیا، دن رات آنکھوں سے آنسو جاری رہتا، نہ آنسو تھمتا تھا، نہ آنکھوں میں نیند کا سرمہ لگتا تھا، باپ لطف ومحبت سے سمجھاتے کہ کہیں روتے روتے تمہارا کلیجہ نہ پھٹ جائے، ماں دلاسا دیتی تھیں کہ جو بیوی اپنے شوہر کی چہیتی ہوتی ہے اس کو اسی قسم کے صدمے اٹھانے پڑتے ہیں، ایک بار غیرت سے ارادہ کیا کہ کنویں میں گر کر جان دے دیں، صفوانؓ کو یہ سب کچھ معلوم ہوا تو غصہ میں تلوار لے کر حسان کی تلاش میں نکلے، حضرت علیؓ نے مسجد میں آکر حرم نبوت کی پاکی اور طہارت پر تقریر کی اور منافقوں کی خباثت کو مطعون کیا، معاملہ یہاں تک بڑھا کہ اوس اور خزرج کے دو قبیلوں میں لڑنے کے لیے تلواریں نکل پڑیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کو چپ کیا، پھر آپ حضرت عائشہؓ کے پاس آئے اور ان کو مخاطب کر کے فرمایا: عائشہ! اگر تم مجرم ہو تو توبہ کرو، خدا قبول کرے گا، ورنہ خدا تمہاری طہارت اور پاکی کی گواہی دے گا، یہ سن کر حضرت عائشہؓ کے آنسو دفعۃً خشک ہو گئے، ایک قطرہ بھی آنکھوں میں نہ تھا، ان کے دل نے اپنی براءت کے یقین کی بنا پر اطمینان محسوس کیا، پھر خود جواب میں اس طرح گویا ہوئیں: اگر میں اقرار کروں، حالانکہ خدا جانتا ہے کہ میں بالکل بے گناہ ہوں، تو اس الزام کے صحیح ہونے میں کسی کو شک نہ رہ جائے گا، اور اگر انکار کروں تو لوگ کب باور کریں گے، میرا حال تو اس وقت یوسفؑ کے باپ کا سا ہے جنھوں نے کہا تھا فصبر جمیل، اس کے بعد وہ وقت بھی آیا کہ عالم غیب کی زبان گویا ہوئی، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کی کیفیت طاری ہوئی تو مسکراتے ہوئے سر اٹھایا، پیشانی پر پسینے کے قطرے موتیوں کی طرح ڈھلک رہے تھے، اور سورۂ نور کی وہ آیتیں تلاوت کر رہے تھے جن سے حضرت عائشہؓ کی پاکدامنی کا یقین دلایا گیا تھا، اس کے بعد قانون ازالۂ حیثیت کے مطابق تینؔ مجرموں کو اسی اسی کوڑے کی سزا دی گئی، حضرت حسانؓ نے اپنے جرم کے کفارہ میں حضرت عائشہؓ کی منقبت میں چند شعر کہے، ان میں ایک کا مطلب یہ تھا کہ وہ پاکدامن ہیں، باوقار ہیں، مشتبہ

نہیں ہیں، وہ بھولی بھالی عورت کے بدن کا گوشت نہیں کھاتی ہیں، یعنی غیبت نہیں کرتی ہیں حضرت عائشہؓ نے یہ سن کر کہا: یہ سچ ہے، مگر تم ایسے نہیں ہو، یہ اشارہ ان کے واقعۂ تہمت میں شرکت کی طرف تھا۔

اس واقعہ کو جس غلط انداز میں مستشرقین پیش کرتے ہیں، اس پر بھی سید صاحبؒ نے بحث کی ہے اور ان کی افترا پردازی اور جہالت کا پول کھول کر رکھ دیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ سر ولیم میور نے لائف آف محمد میں واقعۂ افک کے بیان میں عجیب و غریب تاریخی اور ادبی غلطیاں کی ہیں، مثلاً ان کا بیان ہے کہ

"بنی مصطلق کے خلاف بھیجی ہوئی مہم جب مدینہ واپس آئی تو عائشہ کا محمل آپ کے سامنے دروازہ کے پاس مسجد کے متصل رکھا گیا، لیکن جب کھولا گیا تو وہ خالی تھا، تھوڑی دیر کے بعد صفوانؓ جو ایک مہاجر تھے، نمودار ہوئے، اونٹ پر عائشہؓ بیٹھی ہوئی تھیں اور آگے آگے صفوانؓ تھے۔"

یہی میور آگے چل کر لکھتے ہیں:

"اگرچہ صفوان نے بڑی جلدی کی، تاہم فوج کو نہ پا سکے، بس لوگوں کے اترنے اور خیمہ نصب کرنے کے بعد عائشہ صفوان کی رہبری میں منظر عام کے سامنے داخل شہر ہوئیں۔"

حضرت سید صاحبؒ اس پر ناقدانہ نظر ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ دونوں بیان حدیث و سیر کی ساری کتابوں کے خلاف ہے، اس تصویر کشی سے میور کا مقصود یہ ہے کہ صورت حال اور زیادہ بدنما نظر آئے، حالانکہ متفقہ طور سے ثابت ہے کہ صفوانؓ نے چند گھنٹوں کے فصل سے دوپہر کے وقت اگلی منزل میں فوج کو پالیا، یہ سرے سے مدینہ کا قصہ ہی نہیں۔

ولیم میور کا یہ بھی بیان ہے کہ:

"حسان نے اپنے شاعرانہ تخیل کو بدل کر ایک نہایت عمدہ نظم لکھی، جس میں عائشہ کی عفت، حسن، عقلمندی اور چھریرے خوبصورت بدن کی تعریف تھی، خوشامد بھری ہوئی تعریف نے عائشہ اور

شاعر میں میل کرا دیا۔"

سید صاحبؒ نے اس پر جو تنقید کی ہے، اس کا انداز تحریر یہ ہے کہ کاش انگلینڈ کا مستشرق اعظم ہم کو بتا سکتا کہ تمام شعر میں حضرت عائشہؓ کے حسن، عقلمندی اور چھریرے خوبصورت بدن کی تعریف کس فقرے میں مذکور ہے، شاید ہمارے محقق کو یہ بھی نہیں معلوم کہ حضرت عائشہؓ کو جب یہ شعر سنایا گیا تھا تو ان کا سن اس وقت چالیس برس کا ہوگا، ان کا جسم اس وقت چھریرا نہیں بلکہ پندرہ سولہ برس کے سن میں بھاری ہوگیا تھا۔

حضرت سید صاحبؒ یہ بھی لکھتے ہیں کہ سر ولیم میور کے مشرقی تبحر اور عربی دانی کا ایک مضحکہ خیز اور عجیب نمونہ یہ بھی ہے کہ:

"اس نظم میں حضرت عائشہؓ کے چھریرے خوبصورت بدن کی تعریف تھی، چھریرے بدن کی ہجو سے عائشہؓ کو بہت رنج ہوتا تھا، حسان جب اس فقرے پر پہونچے جس میں ان کی لاغری کی طرف اشارہ تھا تو شوخی کے ساتھ شاعر کو روکا، اور خود شاعر کی فربہی کی برائی کی۔"

اس پر حضرت سید صاحبؒ کا تبصرہ یہ ہے کہ ہم نے اسلامی دنیا کا سارا عرصۂ کائنات چھان ڈالا، لیکن حضرت عائشہؓ کے اس طرز اخلاق اور حلیہ کا پتہ نہیں چلا، ناچار خود سر ولیم میور کے بتائے ہوئے اشارہ پر ہم نے جستجو شروع کی تو نظر آیا کہ تصویر کا قصور نہ تھا، بلکہ خود یورپ کے سب سے بڑے ماہر عربیات کے دماغی شیشہ کا قصور تھا، اصل واقعہ یہ ہے کہ حضرت حسانؓ کے شعر کا دوسرا مصرع یہ تھا:

وتصبح غرثی عن لحوم الغوافل

یعنی وہ بھولی بھالی عورتوں کا گوشت نہیں کھاتی ہیں، عربی محاورہ میں کسی کا گوشت کھانا اس کی غیبت اور پیٹھ پیچھے برائی کرنے سے عبارت ہے، حضرت حسانؓ کا مقصود یہ ہے کہ آپ کسی کی غیبت اور پیٹھ پیچھے برائی نہیں کرتیں، حضرت عائشہؓ نے تعریضاً کہا: لیکن تم ایسے نہیں ہو، یعنی تم غیبت کرتے ہو، اور پیٹھ پیچھے برائی کرنے کے بھی مرتکب ہوئے، یہ واقعۂ افک کی طرف اشارہ تھا، اس سے یہ مقصود

نہ تھا کہ میں دبلی ہوں مگر تم بڑے موٹے ہو، اس جاہلانہ کمال کا تماشہ یورپ کے عجائب زار کے سوا ہم کو کہاں نظر آسکتا ہے۔

اس کے بعد سید صاحبؒ طنزاً لکھتے ہیں کہ آخر ہم کو ان کا ممنون ہونا چاہیے کہ اصل الزام کے بطلان سے ان کو بھی انکار نہیں، لکھتے ہیں:

"ان کی یعنی حضرت عائشہؓ کی ماقبل و مابعد کی زندگی ہم کو بتاتی ہے کہ وہ اس جرم سے بالکل بے گناہ تھیں۔" (ص ۵-۷۳)

حضرت سید صاحبؒ نے اس کتاب میں مارگولیوس کی تدلیس کی شعبدہ بازی کو بھی فاش کیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ ارشاد فرمایا کہ عائشہ! جب تم مجھ سے خوش رہتی ہو یا ناراض رہتی ہو تو مجھ کو پتہ لگ جاتا ہے، ناراض ہوتی ہو تو ابراہیم کے خدا کی قسم، اور خوش رہتی ہو تو محمد کے خدا کی قسم کھاتی ہو۔ حضرت عائشہؓ نے یہ سن کر عرض کیا: یا رسول اللہ! صرف زبان سے نام چھوڑ دیتی ہوں، مارگیولیوس لائف آف محمد میں اسی واقعہ کو ان الفاظ میں لکھتا ہے:

"جب محمد اُن (عائشہؓ) کو ناراض کرتے تو وہ ان کو پیغمبر خدا کہنے سے انکار کر دیتی تھیں، اور ان کی وحی پر نکتہ چینی کرتی تھیں۔"

اتنا لکھ کر سید صاحبؒ اس تحریر پر یہ لکھ کر طنز کرتے ہیں کہ یورپ کی عربی دانی، راست گوئی اور مذہبی بے تعصبی کی یہ کتنی اچھی مثال ہے۔ (ص ۴۸)

حضرت عائشہؓ کی زندگی کا دوسرا اہم واقعہ جنگ جمل کا ہے، جو اسلام کی تاریخ کا ایک المناک سانحہ بھی ہے، چودہ سو سال کے بعد بھی اسلامی حمیت اور ایمانی غیرت یہی کہتی ہے کہ یہ جنگ نہ ہوتی، لیکن تاریخ کا جو فیصلہ ہو چکا وہ کسی حال میں بدلا نہیں جا سکتا، واقعہ تو صرف یہ تھا کہ حضرت عائشہؓ حضرت عثمانؓ کے قاتلوں کی سزا چاہتی تھیں، لیکن اس کی انتہا جنگ جمل تک پہونچ گئی، اس زمانہ کے صحابۂ کرام کو بھی دکھ تھا کہ بھائی بھائی کے

خون کا پیاسا تھا، (ص ۱۱۵) ایک طرف ام المومنین و حرم پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسری طرف نبی کا ابن عم اور داماد تھا، (ص ۱۱۸) مگر جنگ ہو کر رہی، سید صاحبؒ نے اس جنگ کی تفصیل تو تاریخ طبری ہی سے لی ہے، لیکن اس کو اس طرح قلمبند کیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ آنکھوں دیکھا حال بیان کر رہے ہیں، اتنی جزوی تفصیلات بیان کر دی ہیں کہ سارے واقعات آنکھوں کے سامنے پھر جاتے ہیں، سید صاحبؒ کی خوبی یہ ہے کہ اس جنگ میں حضرت عائشہؓ اور حضرت علیؓ دونوں کے وقار کو قائم رکھا ہے، اور اپنے ناظرین کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ یہ جنگ بالکل اتفاقی تھی، اور متقدین جرم کے سوا دونوں فریق بے قصور تھے (ص ۱۳۵) اس جنگ کے بعد حضرت عائشہؓ اپنی ندامت کا اظہار جس طرح کرتی رہیں، اور اس کو جس طرح سید صاحبؒ نے قلمبند کیا ہے، اس سے ان کی عزت اور عظمت کے ساتھ ان کا وزن اور وقار اور بڑھ جاتا ہے، سید صاحبؒ نے اس جنگ میں حضرت عائشہؓ کی شرکت کو ایک اجتہادی غلطی قرار دیا ہے، جس کے متعلق وہ بعد میں خود سوچتی رہیں کہ انھوں نے اس کے ذریعہ اصلاح کا جو طریقہ اختیار کیا تھا وہ کہاں تک مناسب تھا، اس کے لیے ان کو عمر بھر افسوس رہا، حضرت سید صاحبؒ بھی لکھتے ہیں:

"ابن سعد میں ہے کہ وہ کہا کرتی تھیں: اے کاش میں درخت ہوتی، اے کاش میں پتھر ہوتی، اے کاش میں روڑا ہوتی، اے کاش میں نیست و نابود ہوتی۔"

جس طرح انھوں نے اظہار تاسف کیا، اس کا ذکر کرتے ہوئے سید صاحبؒ نے یہ بھی قلمبند کیا ہے کہ:

"بخاری میں ہے کہ وفات کے وقت انھوں نے وصیت کی کہ مجھے روضۂ نبویؐ میں آپؐ کے ساتھ دفن نہ کرنا، بقیع میں اور ازواج کے ساتھ دفن کرنا، میں نے آپؐ کے بعد ایک جرم کیا ہے، ابن سعد میں ہے کہ جب وہ یہ آیت پڑھتی تھیں کہ "اے پیغمبر کی بیویو! اپنے گھر میں ٹھہری رہو"، (احزاب: ۴) تو اس قدر روتی تھیں کہ روتے روتے آنچل تر ہو جاتا تھا۔ (ص ۱۳۵)

اس احساس اور اعتراف کے ساتھ حضرت عائشہؓ کا کردار کتنا باوقار ہو جاتا ہے۔

حضرت سید صاحبؒ نے اپنی روشن ضمیری سے اس جنگ کا یہ روشن پہلو بھی دکھایا ہے کہ:

"یہ صحیح ہے کہ عورت کے طبعی حالات فرائض امامت کے منافی ہیں، اور خود اسلام نے امام کے لیے جو ضروری شرائط قرار دیے ہیں ان سے یہ جنس لطیف کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتی، اس لیے وہ امامت جمہور خلافت الٰہی کے فرائض سے سبکدوش ہے، لیکن اس سے یہ غلط استناد نہیں کرنا چاہیے کہ کسی مسلمان عورت کو کسی حالت میں بھی پبلک کی سیاسی اور فوجی رہبری جائز نہیں، خصوصاً ایسی حالت میں جب ساری ملت میں فتنہ و فساد کی آگ بھڑک رہی ہو، اور اس کے خیال میں مسلمانوں میں کوئی دوسرا اس فتنہ کو بجھانے والا نہ ہو، امام مالکؒ اور امام طبریؒ اور ایک روایت میں امام ابوحنیفہؒ اور بعض دوسرے اماموں کے نزدیک عورت کو امامت اور قضا کا عہدہ مل سکتا ہے، حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں بازار کا انتظام ایک عورت کے سپرد کیا تھا، خود حضرت عائشہؓ جب مسلمان عورتوں کے مجمع میں ہوتیں اور نماز کا وقت ہوتا تو بیچ میں امام بن کر کھڑی ہوتیں۔" (ص ۱۴۴)

حضرت سید صاحبؒ کا امتیازی وصف یہ ہے کہ اسلام میں عورتوں کا جو بلند رتبہ متعین کیا گیا ہے، یا انھوں نے جو کارنامے انجام دیے ہیں ان کا ذکر کرنے میں بڑی فراخ دلی سے کام لیتے ہیں، جیسا کہ معارف میں ان کے مضامین "اسلام میں عورتوں کے حقوق" (اپریل، اکتوبر ۱۹۲۷ء، جون ۱۹۲۸ء) اور خواتین اسلام کی بہادری سے بھی ظاہر ہوگا، (الندوہ ۱۹۰۸ء)

سید صاحبؒ نے جس محنت اور دیدہ وری سے حضرت عائشہؓ کے دینی اور علمی فضل و کمال کی تفصیلات لکھی ہیں، اس کے مطالعہ سے مسلمانوں کے دلوں میں نہ صرف حضرت عائشہؓ کا رتبہ بلند و بالا ہو جاتا ہے، بلکہ کتاب کی افادیت اور دلچسپی میں غیر معمولی اضافہ ہو جاتا ہے، لکھتے ہیں کہ کتاب و سنت اور فقہ و احکام میں ان کا رتبہ اس قدر بلند ہے کہ حضرت عمر فاروق، علی مرتضیٰ، عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم کے ساتھ بے تکلف ان کا نام لیا جا سکتا ہے، (ص ۱۶۶) اسی ایجاز کا پورا اطناب کتاب میں ملے گا۔

حضرت سید صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ کو قرآن مجید کی ایک ایک آیت کی طرز قرارت، محمل معنوی، موقع استدلال اور طریقۂ استنباط پر عبور کامل ہو گیا تھا، وہ ہر مسئلہ کے جواب کے لیے پہلے عموماً قرآن پاک کی طرف رجوع کرتی تھیں، عقائد، فقہ اور احکام کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق اور سوانح کو بھی جو ان کے سامنے کی چیزیں تھیں، اور جن کا تعلق تاریخ و خبر سے ہے وہ قرآن ہی کے حوالہ سے پیش کرتی تھیں، (ص ۱۶۹) پھر عقائد اور فقہ و احکام کے استنباط و استدلال میں وہ جس طرح قرآن مجید کی آیتوں سے استنباط کرتی تھیں، ان کی مثالیں اس طرح دی ہیں کہ یہ قرآنیات کا مفید درس ہر زمانہ میں بنا رہے گا۔

حضرت عائشہؓ کو اپنی فطری ذہانت، قوت حفظ، تفقہ، قوت استنباط، فہم اور ذکاوت سے حدیث کی روایتیں بیان کرنے میں جو اہمیت اور فضیلت حاصل ہوئی، اس کا ذکر سید صاحبؒ نے تفصیل سے کیا ہے، لکھتے ہیں کہ ان کی روایت کی ہوئی حدیثوں کی تعداد اس قدر زیادہ ہے کہ نہ صرف ازواج مطہرات بلکہ مردوں میں چار پانچ کے سوا کوئی ان کی برابری کا دعویٰ نہیں کر سکتا، ان سے دو ہزار دو سو دس روایتیں منسوب ہیں، کثرت روایت کی تعداد کے لحاظ سے ان کا نمبر حضرت ابوہریرہؓ، حضرت ابن عمرؓ اور حضرت انسؓ کے بعد ہے، (ص ۱۸۰-۱۸۱) لیکن سید صاحبؒ یہ بھی لکھتے ہیں کہ محض روایت کی کثرت ان کی فضیلت کا باعث نہیں، اصل چیز دقت رسی اور نکتہ فہمی ہے، مکثرین روایت میں زیادہ تر صرف روایت کش سمجھے جاتے ہیں، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت انسؓ بن مالکؓ، حضرت جابرؓ، حضرت ابوسعید خدریؓ سے کوئی فقہی اجتہاد اور قرآن و سنت سے کوئی غیر منصوص مسئلہ کا استنباط ثابت نہیں، اس مخصوص فضیلت میں حضرت عائشہؓ کے ساتھ صرف عبداللہ بن عباسؓ شریک ہیں جو روایت کی کثرت کے ساتھ تفقہ، اجتہاد، فکر اور قوت استنباط میں بھی ممتاز تھے۔ (ص ۱۸۲)

سید صاحبؒ یہ بھی تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ کی روایتوں کی ایک خاص خصوصیت یہ بھی ہے

کہ وہ جن احکام اور واقعات کو نقل کرتی ہیں، اکثر ان کے علل و اسباب بھی بیان کرتی ہیں، اور خاص حکم جن مصلحتوں پر مبنی ہوتا ہے ان کی تشریح بھی کرتی ہیں، (ص ۱۸۳) ان کی روایتوں کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ جب تک وہ واقعہ کو اچھی طرح سمجھ نہیں لیتی تھیں اس کی روایت نہیں کرتی تھیں، اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی بات ان کی سمجھ میں نہ آتی تو آپؐ سے اس کو بار بار پوچھ کر تسکین کر لیتی تھیں (ص ۱۸۵) اسی طرح جس روایت کو آپ بلا واسطہ نہیں سنتی تھیں بلکہ دوسروں سے حاصل کرتی تھیں ان میں سخت احتیاط کرتی تھیں اچھی طرح جانچ لیتی تھیں، تب اس پر اعتماد کرتی تھیں، اسی اصول کی بنا پر وہ کوئی روایت کسی دوسرے سے لیتی تھیں، اور کوئی شخص اس روایت کو ان سے دریافت کرنے آتا تو بجائے اپنے وہ خود اصل راوی کے پاس سائل کو بھیجتی تھیں، اس سے مقصود یہ بھی تھا کہ بیچ کے واسطے جس قدر کم ہو سکیں اور سند عالی ہو سکے بہتر ہے، (ص ۱۸۶) ان کی فضیلت اس میں بھی ہے کہ انھوں نے سامحات سے نہ صرف روایتوں کو پاک رکھا بلکہ جہاں تک ممکن ہوتا، دوسروں کی روایتوں کی بھی تصحیح کر دیتی تھیں، انھوں نے اپنے معاصرین کے سامحات کا دار و گیر نہایت سختی سے کی، اور ان کی غلط فہمیوں کی اصلاح کی (ص ۱۸۷)

حضرت سید صاحبؒ حضرت عائشہؓ کی اس فضیلت کے بھی قائل تھے کہ بعض مسائل کی نسبت صحابہ میں جو اختلاف روایت ہے وہ کسی قدر اختلاف فہم پر مبنی ہے، حضرت عائشہؓ نے اپنے فہم و ذکا سے اس اختلاف کو بڑی حد تک دور کیا (ص ۱۹۳) پھر حضرت عائشہؓ کی یہ فضیلت بھی بتاتے ہیں کہ جن صحابہؓ نے اپنے اجتہاد یا کسی روایت کی بنا پر کوئی مسئلہ بیان کیا، اور حضرت عائشہؓ نے اپنی واقفیت کی بنا پر اس کو رد کر دیا، تو آج تک حضرت عائشہؓ ہی کا قول مستند ہے، (ص ۱۹۷) سید صاحب یہ بھی لکھتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ نے اپنے معاصرین پر جو نکتہ چینیاں کی ہیں ان میں قوت حفظ کے تفاوت مراتب کو بھی دخل ہے، اس معاملہ میں حضرت عائشہؓ عطیۂ الٰہی سے بدرجۂ اتم سرفراز تھیں، اور اسی عطیۂ الٰہی کی وجہ سے ان کی روایتوں میں شک و شبہہ کی گنجائش نہیں ہوتی ہے۔ (ص ۱۹۹)

سید صاحبؒ رقمطراز ہیں کہ حضرت عائشہؓ قیاس عقلی سے بھی کام لیتی رہیں، مگر وہ سب سے پہلے قرآن مجید کا سہارا لیتیں، اگر اس میں ان کو ناکامی ہوتی تو احادیث کی طرف رجوع کرتیں، اگر اس میں بھی ناکامی ہوتی تو پھر قیاس عقلی سے کام لیتیں، قیاس عقلی سے ان کے استنباطات ایسے ہیں جن پر فقہاء اور مجتہدین نے بڑی بڑی عمارتیں کھڑی کر لی ہیں، (ص ۲۰۶) حضرت سید صاحبؒ نے ان کے ایسے استنباطات کی بھی مثالیں کثرت سے دی ہیں، اور لکھا ہے کہ ان کے بعض فقہی احکام سے ان کے معاصرین کو اختلاف رہا، لیکن فقہائے حجاز کا زیادہ تر ان ہی پر عمل رہا، سید صاحبؒ نے ایسے اختلافات کی بڑی لمبی فہرست دی ہے، اور اپنے ناظرین کی توجہ اس طرف بھی مبذول کرائی ہے کہ حضرت عائشہؓ کے فقہی مسائل کا بہت بڑا ذخیرہ ہے، جس کا اکثر حصہ امام مالکؒ کی مؤطا میں محفوظ ہے، اور مدینہ کی فقہ کی بنیاد اسی پر ہے، (ص ۲۱۵)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد یہ بحثیں اٹھ کھڑی ہوئی تھیں کہ اللہ تعالیٰ کے اعضاء کے معنی حقیقی ہیں یا مجازی، اللہ تعالیٰ کا دیدار آخرت میں ہوگا کہ نہیں، کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ وحی چھپائی تھی، کیا انبیاء معصوم ہوتے ہیں، کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعد اپنے جانشینوں کی ترتیب بتا دی تھی، کیا قبر میں بھی عذاب ہوگا، مردے سنتے ہیں یا نہیں؟ ان باتوں میں حضرت عائشہؓ کے جو عقائد رہے، اور کلامی رنگ میں جس طرح ان کی تصریح کی ہے اس کا مطالعہ بھی موجودہ دور کے متکلمین کے لیے بہت مفید ہوگا۔

حضرت سید صاحبؒ نے "علم اسرار دین" کے عنوان سے لکھا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے اسرار شریعت کے بعض سربمہر خزانوں کو سب سے زیادہ وقف عام کیا، سید صاحبؒ نے اس کی لمبی تفصیل بتائی ہے کہ بعض مسائل کے جو اسرار و حقائق احادیث میں ہیں ان کا انکشاف حضرت عائشہؓ کس طرح برابر کرتی رہیں، اس سلسلہ میں قرآن مجید کی ترتیب نزول، مدینہ میں اسلام کی کامیابی کا سبب، سفر میں

دو رکعت نماز کی وجہ، فجر کی نماز میں دو رکعت رکھنے کی مصلحت، صوم عاشورا کا سبب، پورے رمضان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تراویح کیوں نہیں پڑھی، وادیٔ محصب میں قیام کرنے نہ کرنے کی بحث، تعمیر کعبہ اور بعض اعمال حج کے مسائل، سوار ہو کر طواف کرنے کی سنت، ہجرت کے معنی، اور آپؐ کا اپنے حجرۂ مبارک میں دفن ہونے کے سبب پر حضرت عائشہؓ نے اپنے جن خیالات کا اظہار کیا ہے، ان سب کو قلمبند کر کے سید صاحبؒ نے دینی معلومات کا ایک بہت ہی مفید ذخیرہ جمع کر دیا ہے، جس سے حضرت عائشہؓ کے فضل و کمال کا مرقع بھی سامنے آجاتا ہے،

ان کے فضل و کمال میں یہ لکھ کر بھی اضافہ کیا ہے کہ ان کو طب، تاریخ، ادب، خطابت اور شاعری میں بھی بڑی دستگاہ حاصل تھی، ان کو بعض بیماریوں کی مجرب دوائیں معلوم تھیں، لڑائیوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جاتی تھیں تو زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آخر عمر میں بیمار رہا کرتے تھے، اطبائے عرب ان کی بیماری کے سلسلہ میں جو کچھ بتاتے، اس کو وہ یاد کر لیتی تھیں، (ص ۲۴۳)

عرب کے حالات، جاہلیت کے رسوم اور قبائل کے باہمی انساب کی واقفیت میں حضرت ابوبکرؓ کو مہارت تامہ حاصل تھی، حضرت عائشہؓ نے ان فنون کی واقفیت ان ہی سے حاصل کی، اسی لیے عرب جاہلیت کے رسوم، اور معاشرتی حالات کے متعلق بعض نہایت قیمتی معلومات حدیث کی کتابوں میں ان ہی کی زبانی منقول ہیں، محدثین کی محفل میں انصار کی جنگ بعاث کا تذکرہ ان ہی کی زبانی سنا جا سکتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آغاز وحی اور ابتدائے نبوت کے مفصل حالات، ہجرت کے تفصیلی واقعات ان ہی کی زبانی لوگوں نے سنے، قرآن کیونکر اور کس ترتیب سے نازل ہوا، نماز کی کیا کیا صورت اسلام میں پیدا ہوئی؟ ان ہی نے بتایا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض الموت کی مفصل کیفیت ان ہی کی زبان سے سن کر دنیا نے جانا، جنگ احد کی کیفیت، غزوۂ خندق کے کچھ حالات، غزوۂ بنی قریظہ کی بعض جزئیات،

غزوۂ ذات الرقاع میں نماز خوف کی کیفیت، فتح مکہ میں عورتوں کی بیعت، حجۃ الوداع کے واقعات کے ضروری اجزاء ان ہی سے ہاتھ آئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارک کے متعلق صحیح معلومات ان ہی نے بہم پہونچائے، آپؐ کی عبادت شبانہ، آپؐ کے خانگی مشاغل، آپؐ کے ذاتی اخلاق کا صحیح نقشہ ان ہی نے ہم کو کھینچ کر دکھایا، آپؐ پر سب سے سخت دن کون سا گذرا، ان ہی نے ہم کو سنایا، آپؐ کے بعد حضرت ابوبکرؓ کی وفات، حضرت فاطمہؓ اور ازواج مطہرات کا دعویٰ، حضرت علیؓ کا ملال خاطر اور پھر بیعت کے تمام مفصل واقعات بروایات صحیحہ ان ہی سے معلوم ہوئے (ص ۲۴۴ - ۲۴۶) یہ کیسے مفید اور اہم معلومات ہیں جن کے لیے امت مسلمہ حضرت عائشہؓ ہی کی ممنون ہے۔

سید صاحبؒ نے یہ بھی دکھایا ہے کہ وہ نہایت شیریں کلام اور فصیح البیان بھی تھیں، اس کی تائید میں احنف بن قیس تابعی بصریؒ کا بیان نقل کیا ہے کہ کسی مخلوق کے منہ کی بات حسن بیان اور متانت میں حضرت عائشہؓ کے منہ کی بات سے عمدہ اور بہتر نہیں سنی، سید صاحبؒ نے حضرت معاویہؓ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ میں نے عائشہ سے زیادہ بلیغ، زیادہ فصیح اور زیادہ تیز فہم کوئی خطیب نہ دیکھا (ص ۲۴۸) ان کی تقریروں میں حسن گفتار، آواز میں بلندی اور لہجہ میں رعونت اور جلالت ہوتی۔ (ص ۲۴۸)

حضرت ابوبکرؓ شعر و سخن کے بڑے دلدادہ تھے، حضرت عائشہؓ نے یہ فن آغوش پدری میں سیکھا، ان کو کعبؓ بن مالک کا پورا قصیدہ یاد تھا، احادیث کی کتابوں میں ان کی زبانی بہت سے اشعار مروی ہیں، سید صاحبؒ نے حضرت عائشہؓ کی زبانی وہ بہت سے اشعار بھی نقل کیے ہیں جو انھوں نے موقع بموقع برجستہ پڑھے، حسان بن ثابتؓ کا وہ پورا قصیدہ ان کو یاد تھا جو انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں آپؐ کے مخالفوں کے جواب میں کہا تھا۔

سید صاحبؒ نے اس کی بھی تفصیل لکھی ہے کہ حضرت عائشہؓ نے علم اور تعلیم کی اشاعت کس طرح کی، لکھتے ہیں کہ لڑکے، عورتیں، اور جن مردوں کا پردہ حضرت عائشہؓ سے نہ تھا، وہ حجرہ کے اندر آکر مجلس میں

بیٹھتے تھے، اور لوگ حجرہ کے سامنے مسجد نبوی میں بیٹھتے، دروازہ پر پردہ پڑا رہتا، پردہ کی اوٹ میں وہ خود بیٹھ جاتیں، لوگ سوالات کرتے، یہ جواب دیتیں، کبھی کوئی مسئلہ بحث میں چھڑتا اور استاذ و شاگرد خاص موضوع پر گفتگو کرتے، کبھی خود کسی مسئلہ کو چھیڑ کر بیان کرتیں، اور لوگ خاموشی کے ساتھ سنتے رہتے، شاگردوں کی زبان، طرز ادا، اور صحت تلفظ کی بھی سخت نگرانی کرتی تھیں، ان عارضی طالب علموں کے علاوہ جو کبھی کبھی حلقۂ درس میں شریک ہوتے تھے، وہ خاندان کے لڑکوں اور لڑکیوں کو اور شہر کے یتیم بچوں کو اپنی آغوش تربیت میں لیتی تھیں، اور ان کی تعلیم و تربیت کرتی تھیں، کبھی ایسا بھی ہوا کہ غیر لڑکوں کو جو کہ بڑے ہو چکے تھے اپنی بہنوں، یا بھانجیوں سے دودھ پلواتی تھیں اور خود ان کی رضاعی خالہ یا نانی بن کر ان کو اندر آنے کی اجازت دیتی تھیں، جن کو اندر آنے کی اجازت نہ تھی، یعنی محرم نہ تھے، وہ افسوس کرتے تھے کہ ان کو حصول علم کا موقع اچھی طرح نہیں ملا، مثلاً قبیصہ رضہ کہتے تھے کہ عروہ مجھ سے علم میں اس لیے بڑھ گئے کہ وہ اندر جاتے تھے، امام نخعی رحمہ عراق کے متفق علیہ امام تھے، وہ لڑکپن میں حضرت عائشہ رضہ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، ان کے دوسرے معاصرین کو اس پر رشک ہوتا تھا، حضرت عائشہ رضہ کا معمول تھا کہ ہر سال حج کو جاتیں، اسلام کا وسیع دائرہ سال میں ایک دفعہ سمٹ کر ایک نقطہ پر جمع ہو جاتا تھا، کوہ حرا اور شہر کے درمیان حضرت عائشہ رضہ کا خیمہ نصب ہوتا تھا، تشنگان علم جوق در جوق دور دراز ممالک سے آکر حلقۂ درس میں شریک ہوتے، مسائل پیش کرتے، اپنے شبہات کا ازالہ چاہتے، لوگ بعض مسائل کو پوچھتے جھجکتے تو ڈھارس بندھاتیں، ایک صاحب ایک بات پوچھنا چاہتے تھے، لیکن شرماتے تھے، آپ نے فرمایا: جو تم اپنی ماں سے پوچھ سکتے تھے، مجھ سے بھی پوچھ سکتے ہو، وہ اپنے شاگردوں کو ماں ہی بن کر تعلیم دیتی تھیں، یعنی بچوں کو متبنیٰ کر لیتی تھیں، ان کے مصارف کی بھی ذمہ دار ہو جاتی تھیں، وہ اپنے بعض شاگردوں کے ساتھ وہ برتاؤ کرتی تھیں کہ ان کے عزیزوں کو ان پر رشک ہوتا تھا۔

مستفیدین اور تلامذہ کی تعداد کم نہ تھی، مسند ابن حنبل میں حضرت عائشہ رضہ کی سب سے زیادہ حدیثیں

ہیں، ان حدیثوں کو جن لوگوں نے ان سے روایت کیا ہے، ان کی تعداد تقریباً دو سو تک پہونچتی ہے۔

جن صحابۂ کرام رضہ نے ان سے استفادہ کیا ہے، سید صاحب رحمہ نے ان کے نام بھی گنائے ہیں، جن غلاموں نے ان سے تعلیم پائی ان کی تعداد بھی بتائی ہے، جن عزیزوں کو تعلیم دی ان کے نام بھی لکھے ہیں، تابعین میں تقریباً ڈیڑھ دو سو ان کے خوشہ چین ہوئے، جن پردہ نشینوں نے اس پردہ حرم سے فائدہ اٹھایا، ان کے نام کے ساتھ سید صاحب رحمہ نے ان کے حالات بھی قلمبند کر دیے ہیں جن کے مطالعہ سے پورا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

سید صاحب رحمہ نے "افتاء" کے عنوان سے لکھا ہے کہ خلفائے اسلام، علمائے صحابہ رضہ، عام مسلمان بلا و مشکلات کی حالت میں ان ہی کے آستانہ کی طرف رجوع کرتے، خلفائے راشدین کے پورے زمانے میں منصب افتاء پر ممتاز رہیں، امیر معاویہ رضہ دمشق میں حکومت کرتے تھے، لیکن ضرورت پڑتی، تو شام سے قاصد بھیج کر مسائل دریافت کرتے، صحابۂ کرام رضہ کو کوئی مسئلہ ایسا مشکل نظر نہیں آیا جس کا علم انھوں نے حضرت عائشہ رضہ کے یہاں نہیں پایا، ان کے فتاویٰ میں ہر قسم کے جوابات ہوتے، لیکن زیادہ تر زنانہ مسائل، زن و شو کے تعلقات، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات، آپ کے شبانہ عبادات اور ذاتی حالات کے متعلق ہوتے، اور بقول علامہ ابن حزم رحمہ اور حافظ ابن قیم رحمہ ان کو یکجا کیا جائے تو ایک دفتر تیار ہو جائے۔ (ص ۲۶۳ - ۲۶۷) اس علم و فضل کے باوجود اگر ان کے سامنے کوئی ایسا استفتاء پیش ہوتا جس کے متعلق ان کو کوئی مستند واقفیت نہ ہوتی، یا ان سے بہتر کوئی جواب دینے والا ہوتا تو مستفتی کو اس کے پاس جانے کا حکم دے دیتیں (ص ۲۷۴)

حضرت سید صاحب رحمہ نے "ارشاد" کا عنوان قائم کر کے یہ بتایا کہ حضرت عائشہ رضہ نے دائیٔ مذہب کی آواز جب کبھی پست ہوتے دیکھی تو اس آواز کو بار بار کی صدائے بازگشت سے خاموش نہ ہونے دیا، یعنی جب کوئی غیر اسلامی اور غیر شرعی باتیں ہوتے دیکھتیں تو اپنے ارشاد سے روک دیتیں، حضرت عثمان رضہ کے عہد میں

سازشوں کا جو جال پھیل رہا تھا، اس سے مذہب کا تار و پود ادھڑ رہا تھا، اس کو دیکھ کر حضرت عائشہؓ کا دل دکھتا تھا، جنگ جمل کی شرکت بھی اسی درد دل کا نتیجہ تھی، مصر و عجم کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے حضرت عثمانؓ کی طرف سے اس قدر ناراضگی پھیلنی شروع ہوئی کہ بعض لوگ ان پر لعنت بھیجنے لگے، اس کو یہ کہہ کر رد کرنے کی کوشش کی کہ جبرئیل وحی لاتے، عثمانؓ اس وقت موجود ہوتے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے کاندھے پر ہاتھ مار کر کہتے: ہاں عثمان! یہ لکھو، خدائے پاک و برتر یہ مرتبہ فروتر لوگوں کو عطا نہیں کرسکتا، اس بنا پر جو عثمانؓ کو گالیاں دے، اس پر خدا کی لعنت ہو، (ص ۲۷۵)

چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی دار و گیر کرتی رہتیں، کبوتر بازی، شطرنج بازی اور نرد بازی جیسے لہو و لعب کو روکنے کی تلقین کرتی رہتیں، موسم حج میں ان کی قیام گاہ لاکھوں مسلمانوں کے قلوب کا مرکز بن جاتی تھی، عورتیں چاروں طرف سے گھیرے رہتیں، اسی درمیان میں ارشاد و ہدایت کے فرائض بھی انجام دیتی رہتیں، ایک دفعہ ایک عورت کو دیکھا کہ اس کی چادر پر صلیب کے نقش و نگار بنے ہیں، دیکھنے کے ساتھ ڈانٹا کہ یہ چادر اتار دو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایسے کپڑوں کو دیکھتے تو پھاڑ ڈالتے، اسی طرح حفصہ بنت عبدالرحمٰن آپ کی بھتیجی تھیں، وہ ایک دن نہایت باریک دوپٹہ اوڑھ کر پھوپھی کے پاس آئیں، دیکھنے کے ساتھ ہی ان کے دوپٹہ کو غصہ سے چاک کر ڈالا، پھر فرمایا: تم نہیں جانتیں کہ سورہ نور میں خدا نے کیا احکام نازل کیے ہیں؟ اس کے بعد دوسرا گاڑھے کا دوپٹہ منگوا کر اوڑھایا، (ص ۲۷۹)

حضرت سید صاحبؒ نے اس قسم کے رشد و ہدایت کے بہت سے واقعات قلمبند کیے ہیں، جن کے مطالعہ سے مسلمانوں کا معاشرہ آج بھی سنوارا جاسکتا ہے، بشرطیکہ مذہبی حمیت اور ایمانی غیرت کا جذبہ ہو،

جنس نسوانی پر حضرت عائشہؓ نے جو احسانات کیے ہیں ان کی تفصیل بھی سید صاحبؒ نے لکھی ہے، ان کا سب سے بڑا احسان تو یہ ہے کہ انھوں نے دنیا کو یہ بتادیا کہ مسلمان عورت پردہ میں رہ کر بھی علمی، مذہبی، اجتماعی، سیاسی، پند و موعظت، اصلاح و ارشاد اور امت کی بھلائی کے کام بجا سکتی ہے، اسلام نے

عورتوں کو جو رتبہ بخشا ہے اور ان کی گذشتہ گری ہوئی حالت کو جتنا اونچا کیا ہے، ام المومنینؓ کی زندگی کی تاریخ اس کی عملی تفسیر ہے، (ص ۲۸۳) وہ ہر موقع پر عورتوں کی حمایت کرتیں، ان کی عرضداشتیں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہونچاتیں، صحابہؓ کو اپنی بیویوں کے فریضہ کو ادا کرنے کی تاکید کرتیں، جو خاتون رات بھر عبادت کرتی اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ پیام پہونچاتیں کہ کام اتنا کیا جائے جو نبھ سکے، ایک عورت نے چوری کی، سزا پانے کے بعد تائب ہوگئی، پھر بھی اور بی بیاں اس سے ملنا پسند نہیں کرتی تھیں، لیکن حضرت عائشہؓ اس سے ملتی تھیں، بلکہ ضرورت پڑتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک بھی اس کی درخواست پہونچا دیتی تھیں، عورتوں کو جو لوگ ذلیل سمجھتے تھے ام المومنینؓ ان سے سخت برہم ہوتی تھیں، کسی مسئلہ سے ان کی ذلت اور حقارت کا پہلو نکلتا تو وہ اس کو صاف کر دیتی تھیں بعض صحابیوں نے روایت کی ہے کہ عورت، کتا، اور گدھا اگر نماز میں نمازی کے سامنے سے گذر جائے تو نماز ٹوٹ جاتی ہے، حضرت عائشہؓ کو یہ معلوم ہوا تو ان کو دکھ پہونچا، اور فرمایا کہ یہ کتنا برا ہے کہ ہم کو گدھے اور کتے کے برابر کردیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھا کرتے تھے اور میں آگے لیٹی رہتی تھی، اسی طرح جب حضرت ابوہریرہؓ نے بیان کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نحوست تین چیزوں میں ہے، گھوڑی، گھر اور عورت، یہ سن کر حضرت عائشہؓ کو بہت غصہ آیا، بولیں: قسم اس ذات کی جس نے آپؐ پر قرآن اتارا، آپؐ نے ہرگز یہ نہیں فرمایا، البتہ یہ فرمایا ہے کہ اہل جاہلیت ان سے نحوست کی فال نکال لیتے تھے، (ص ۲۸۶) فقہی احکام میں صحابہ مختلف الرائے ہوتے تو حضرت عائشہؓ ہمیشہ وہ پہلو اختیار کرتیں جس میں عورتوں کے لیے سہولت اور آسانی ہوتی، خصوصاً طلاق رجعی، طلاق بائن، عدت اور نان نفقہ کے مسئلہ میں وہ ایسی رائے دیتیں جو عورتوں کے حق میں ہوتی، وراثت میں بعض ایسی صورتیں بھی پیش آئیں جن کے حل کرنے کے لیے کتاب و سنت سے فکر و استنباط کی ضرورت پیش آئی، تو ان موقعوں پر حضرت عائشہؓ نے اپنی جنسی بہنوں کا حق فراموش نہیں کیا، مثلاً ایک صورت یہ ہے کہ اگر لڑکا وارث نہ ہو، صرف بیٹیاں پوتیاں

اور پوتے ہوں تو تقسیم کیونکر ہوگی، حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ پوتیوں کا حصہ نہیں دلاتے، صرف پوتوں کا حصہ دیتے ہیں، حضرت عائشہؓ پوتیوں کا بھی حصہ لگاتی ہیں (ص ۲۹۰)

آخر میں حضرت سید صاحبؒ نے عالم نسوانی میں حضرت عائشہؓ کا درجہ متعین کیا ہے، اور لکھتے ہیں کہ وہ علامہ ابن تیمیہؒ اور ان کے شاگرد حافظ ابن قیمؒ کی طرح اس کے قائل ہیں کہ اگر نسبی شرافت کا اعتبار ہے تو حضرت فاطمہ زہراؓ سب سے افضل ہیں، اگر ایمان کی سابقیت، اسلام کی ابتدائی مشکلات کے مقابلہ اور اس زمانہ میں حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی اعانت و تسکین کی حیثیت سے دیکھیے تو حضرت خدیجہ کبریٰؓ کی زندگی سب پر مقدم ہے، لیکن اگر علمی کمالات، دینی خدمات اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات وارشادات کے نشر واشاعت کی فضیلت کا پہلو سامنے ہو تو ان میں صدیقہ کبریٰ یعنی حضرت عائشہؓ کا کوئی حریف نہیں، (ص ۲۹۸)

اوپر کی تفصیلات پڑھنے کے بعد ناظرین اس راقم پر یہ الزام رکھ سکتے ہیں کہ کتاب پر تبصرہ کرنے کے بجائے اس کی تلخیص پیش کی جارہی ہے، یہ الزام صحیح ہے، لیکن ان تفصیلات کو پڑھنے کے بعد یہ اندازہ بھی ہوگیا ہوگا کہ یہ کیسی دلچسپ، مفید، پُر از معلومات، بلکہ ایمان پرور ہیں، اگر ان کا مطالعہ اصل کتاب میں کیا جائے تو ایسے تاثرات میں اور بھی غیر معمولی اضافہ ہوجائے۔

یہ لکھنے میں تامل نہیں کہ حضرت عائشہؓ کی اس سیرت سے بہتر، مفید تر اور مفصل تر کتاب عربی میں بھی نہیں لکھی گئی، امام طبریؒ یا ابن خلکان حضرت عائشہؓ کی سیرت پر کوئی مکمل کتاب لکھتے تو وہی سب کچھ لکھتے جو حضرت سید صاحبؒ نے لکھ دیا ہے، اور یہ کتاب اردو خوان مسلمان عورتوں کے لیے قندیل ہدایت بنی ہوئی ہے اور آیندہ بھی بنی رہے گی، خدا جانے کتنے بے شمار عقائد اور مسئلہ مسائل کے مستند معلومات اس سے حاصل ہوتے رہیں گے۔

حضرت سید صاحبؒ نے حضرت عائشہؓ کی جو کردار نگاری کی ہے اس کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چہیتی بیوی اور کاشانۂ نبوت کی ملکہ بھی دکھائی دیتی ہیں، ناموسِ اسلام کی مریم اور شفیق ام المومنین بھی نظر آتی ہیں، وہ قرآنیات، حدیث، فقہ، کلام، عقائد، اسرار دین، درس و تدریس، ادب اور شاعری کی ماہر کی حیثیت سے بھی سامنے آتی ہیں، لیکن ہر حال میں وہ عورت ہی دکھائی گئی ہیں، کہیں اور کسی موقع پر ان میں مافوق البشریت کا پہلو آنے نہیں دیا گیا ہے، جس سے وہ آسمانی دیوی یا یونانی دیومالا کے ماورائی تخیل کا کوئی کردار سمجھی جائیں، البتہ یہ ضرور دکھایا گیا ہے کہ ان میں بیوی کی حیثیت سے شوہر کے ساتھ جو محبت تھی، یا طبیعت میں جو رحم، شفقت، ہمدردی، سخاوت، خودداری، خودستائی سے پرہیز، غلاموں پر شفقت، عفو اور ہم جنسوں کی اعانت کا جو جذبہ تھا، عبادت گذاری اور خداترسی کا جو نمونہ دکھایا، یا علمی حیثیت سے جو فہم، ادراک، ذکاوت اور ذہانت تھی وہ عام عورتوں میں نہیں پائی جاسکتی ہے، سید صاحبؒ نے ان کے ان ہی اوصاف کی مصوری اس خوبی سے کی ہے کہ وہ کتاب میں تفصیلات جامد ہونے کے بجائے متحرک تصویروں کی طرح دکھائی دیتی ہیں۔

یہ کتاب زبان اور انداز بیان کے لحاظ سے بھی منفرد حیثیت رکھتی ہے، سید صاحبؒ کی نظر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کے بعد سب سے زیادہ محترم اور قابل تعظیم حضرت عائشہؓ ہی کی ذات مبارک تھی، ظاہر ہے کہ اس کے بعد اس میں ان کا انداز بیان اور اسلوب کیسا ہونا چاہیے، باادب، باوقار، باوزن اور باتمکنت، ان ہی خصوصیات کے ساتھ یہ پوری کتاب لکھی گئی ہے، اس میں ادب ان کے قلم کو چومتا ہے، وقار ان کی تحریر سے ہم رکاب رہتا ہے، وزن ان کے انداز بیان سے کبھی علیحدہ نہیں ہوتا ہے، تمکنت پوری کتاب کی فضا پر چھائی رہتی ہے، الندوہ کی مضمون نگاری سے ان کا قلم منجھ چکا تھا، ارض القرآن ان کی تحقیقی تصنیف ہے تحقیق وتلاش کے سلسلہ میں اس کے ذریعہ سے ان کو جو تجربات حاصل ہوئے تھے، ان کو اس کتاب میں اچھی طرح بروئے کار لائے ہیں، ارض القرآن میں موضوع کے لحاظ سے ان کے انشاپردازانہ انداز کا جوہر دبا رہا، وہ اس کتاب میں کہیں کہیں ابھر گیا ہے، کچھ مثالوں سے ہمارے

ناظرین بھی لطف اندوز ہوں:

"عورت کے متعلق مشرق و مغرب کا مذاق باہم نہایت مختلف ہے، مشرق میں عورت کی محبت دامنِ تقدس کا داغ ہے، وہ نقط ایوان عیش کی شمع دل فروز ہے، جس کی روشنی عزلت نشینانِ حریم قدس کے تنگ حجروں کو اور بھی تاریک کر دیتی ہے، دوسری طرف محبت کیش مغرب اس کو خدا سمجھتا ہے، یا خدا کے برابر جانتا ہے، کہتا ہے کہ جو عورت کی مرضی وہ خدا کی مرضی، یورپ کے نزدیک کسی مذہب کے معقول ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اس نے عورت کا کیا درجہ قائم کیا ہے، اسلام کا صراطِ مستقیم افراط و تفریط کے وسط سے نکلا ہے، وہ نہ عورت کو خدا جانتا ہے، نہ زندگی کی راہ کا کانٹا سمجھتا ہے، اس نے عورت کی بہترین تعریف یہ کی کہ وہ مردوں کے لیے اس کشمکش گاہ عالم میں تسکین و تسلی کی ودیعت ہے"۔ (ص ۳۳)

دنیا کی مقتدر غیر مسلم عورتوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"دنیا کی غیر مسلم عورتوں کی فہرست میں جو نام داخل ہیں اس میں زیادہ تر ایسی عورتیں ہیں جن سے اپنی سطح ہستی سے ذرا بلند کوئی اتفاقی کارنامہ ظہور میں آگیا وہی ان کی شہرت کا بال و پر بن گیا، ایک عورت نے کسی پُرجوش مجمع میں کوئی تقریر کر دی، کسی تدبیر سے دشمنوں کی سازش کو توڑ دیا، اپنی قوتِ بازو سے کسی میدان کو مار لیا، یہ فوری اسباب اس کی تاریخی بقا اور شہرت کا ذریعہ بن گئے، غور سے دیکھیے کیا اس کا مقابلہ ایک مسلسل با نظام اور مستمر العمل کارنامہ سے ہو سکتا ہے، حسن و جمال کی غیر معمولی سحر کاری اور کسی محروم الولد خاندان شاہی کے تاج زرنگار نے بھی اکثر جنسِ نسوانی کے چہرہ کو روشن کیا ہے، لیکن دیکھ لیجیے تاریخ نے ہمیشہ حسرت و ناکامی پر ہی اس منظر کا خاتمہ کیا ہے، مصر، ایران اور روم کی یہ تاریخی روداد بھی آپ کے سامنے ہے، اس سے ایک کامیاب، مقدس اور بار ساز زندگی کا موازنہ کیا سوء ادب نہیں، ان عمومی حیثیتوں کو الگ الگ کر کے مذہب، اخلاق اور تقدس کا

پہلو سامنے لائیے تو معلوم ہو جائے گا کہ کائنات نسوانی کا ایک ستارہ بھی اس افق سے طلوع ہونے کے قابل نہیں، ہندوستان کی بعض معصوم صورت دیبیاں آگے بڑھ کر اپنا استحقاق پیش کریں گی لیکن آپ پوچھ سکتے ہیں کہ عفیفو! طبیعت کی پاکیزگی اور شوہر پرستی کی مسلم دلیلوں کے علاوہ اور کوئی سند بھی اپنے پاس رکھتی ہو؟" (ص ۲۹۶)

اسی سلسلہ میں جب حضرت عائشہؓ کا ذکر کرتے ہیں تو اس میں زورِ بیان اس طرح پیدا ہو جاتا ہے:

"صدیقہ کبریٰؓ کے سوا دنیا کی کون خاتون ہے جس نے مذہب و اخلاق اور تقدس کے ساتھ مذہبی، علمی، سیاسی، معاشرتی، غرض گوناگوں فرائض انجام دیے ہوں اور جس نے اپنی زندگی کے کارناموں سے، خدا پرستی کے نمونوں سے، اخلاق کی عملی مثالوں سے، روحانیت کی پاک تعلیموں سے، اور کسی دین و شریعت اور قانون کی تعلیم و تشریع سے دنیا کی کروڑوں عورتوں کے لیے ایک کامل زندگی اور گراں بہا عملی نمونہ چھوڑا ہو، اور جس نے اس عظیم الشان تمدن انسانی کو اپنے مذہبی، اجتماعی اور علمی احسانات سے گراں بار کیا ہو"۔ (ص ۲۹۶)

حضرت سید صاحبؒ کے چھوٹے چھوٹے جملوں میں جو کیفیت ہے، اس سے بھی ذرا لذت آشنا ہوں:

"عورت کے لیے دنیا کی سب سے تلخ چیز ایک سوکن کا وجود ہے، حضرت عائشہؓ ایک سے لے کر آٹھ آٹھ سوکنوں تک کے ساتھ رہیں، تاہم شرفِ صحبت کے پرتو سے یہ آئینے ہر قسم کے زنگ و غبار سے پاک تھے۔ (ص ۵۴)

حضرت عائشہؓ اپنے ناز و ادا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو باتیں کہہ جاتیں، سید صاحبؒ نے ان کو جس پُرکیف اور بے تکلف انداز میں ادا کیا ہے، اس سے بھی محظوظ ہوا جا سکتا ہے:

"حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ جب یہ حکم اترا کہ اگر کوئی عورت اپنے آپ کو پیغمبر کے حوالے کر دے، یعنی مہر معاف کر کے زوجیت میں داخل ہو تو جائز ہے، مجھے غیرت آئی کہ کیا کوئی عورت ایسا بھی کر سکتی ہے، لیکن جب ارجاکی آیت اتری جس میں آپؐ کو اختیار دیا گیا تھا کہ آپؐ جس بیوی کو چاہیں پاس بلالیں یا اس کے پاس رات گذاریں، اور جس کو چاہیں نہ بلائیں تو میں نے کہا آپ کا خدا دیکھتی ہوں کہ آپ کی ہر خواہش کو جلد پوری کر دیتا ہے (ص ۴۶-۴۵)

اس پر حضرت سید صاحبؒ تبصرہ کرتے ہیں کہ اس قول کا منشا نعوذ باللہ اعتراض نہیں، بلکہ بیوی کا محبوبانہ ناز ہے۔ جس کے کچھ نمونے اور بھی ہیں۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت خدیجہؓ کو اکثر یاد کرتے، جس سے دوسری مدعی محبت بیویوں کو تکلیف ہوتی تھی، ایک بار آپ اسی طرح ان کا تذکرہ فرما رہے تھے کہ حضرت عائشہؓ بول اٹھیں، یا رسول اللہؐ آپ کیا اس بڑھیا کا ذکر بار بار چھیڑا کرتے ہیں، اللہ نے آپ کو اس سے اچھی بیویاں دی ہیں، آپؐ نے فرمایا: مجھ کو خدا نے اولاد اسی سے دی۔" (ص ۴۶)

ایک بار کہیں سے کوئی قیدی گرفتار ہو کر آیا تھا، وہ حضرت عائشہؓ کے حجرے میں بند تھا، یہ ادھر عورتوں سے باتیں کر رہی تھیں، وہ ادھر لوگوں کو غافل پا کر بھاگ نکلا، آپ تشریف لائے تو گھر میں قیدی کو نہ پایا، دریافت کیا تو واقعہ معلوم ہوا، غصہ میں فرمایا: تمھارے ہاتھ

کٹ جائیں، پھر باہر نکل کر صحابہؓ کو خبر دی، وہ گرفتار ہو کر آیا، آپؐ جب اندر تشریف لائے تو دیکھا کہ حضرت عائشہؓ اپنے ہاتھوں کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہی ہیں، پوچھا: عائشہ! کیا کر رہی ہو؟ عرض کی: دیکھتی ہوں کہ کون ہاتھ کٹے گا، آپ متاثر ہوئے، اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے، (ص ۴۷)

ایک دن حضرت عائشہؓ نے در پردہ کہا کہ یا رسول اللہ! اگر دو چراگاہیں ہوں، ایک اچھوتی اور دوسری چری ہوئی تو آپ کس میں اونٹ چرانا پسند فرمائیں گے؟ جواب دیا: پہلی میں (ص ۴۷)

سید صاحبؒ نے اتنا لکھ کر یہ تصریح کی ہے کہ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ بیویوں میں صرف عائشہؓ ہی ایک کنواری تھیں۔

آپ نے ایک دفعہ ارشاد فرمایا کہ عائشہ جب تم مجھ سے خوش رہتی ہو یا ناراض ہوتی ہو تو مجھ کو پتہ لگ جاتا ہے، ناراض ہوتی ہو تو ابراہیمؑ کے خدا کی قسم اور خوش رہتی ہو تو محمدؐ کے خدا کی قسم کھاتی ہو، عرض کی: یا رسول اللہ! صرف زبان سے نام چھوڑ دیتی ہوں (ص ۴۸)

ایک دفعہ حضرت عائشہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ بڑھ کر بول رہی تھیں، حضرت ابوبکرؓ آ گئے، انھوں نے یہ گستاخی دیکھی تو اس قدر برہم ہوئے کہ بیٹی کو مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فوراً آڑے آگئے، حضرت ابوبکرؓ چلے گئے تو فرمایا: کہو، میں نے تم کو کیسا بچایا، (ص ۴۱-۴۰)

ایک دفعہ حضرت عائشہؓ کے سر میں درد تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مرض الموت شروع ہو رہا تھا، آپؐ نے فرمایا کہ اگر تم میرے سامنے مرتیں تو میں تم کو اپنے ہاتھ سے غسل دیتا، اور اپنے ہاتھ سے تمھاری تجہیز و تکفین کرتا، تمھارے لیے دعا کرتا، عرض کی:

یارسول اللہ! آپ میری موت مناتے ہیں، اگر ایسا ہو جائے تو آپ اسی حجرے میں نئی بیوی لاکر رکھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر تبسم فرمایا، (ص ۴۷)

واقعۂ افک کے سلسلہ میں حضرت عائشہؓ پر رنج، ملال، اندوہ، غم، آزردگی اور پریشانی کا ایسا عالم طاری ہوا کہ بیمار پڑ گئیں، آنکھیں آنسوؤں سے پُرنم رہتیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس باہر سے تشریف لاتے اور کھڑے کھڑے پوچھ لیتے کہ اب ان کا کیا حال ہے؟ یہ سن کر حضرت عائشہؓ کو خیال ہوتا کہ اب پہلے سا التفات باقی نہیں رہا، روتے روتے برا حال ہوگیا، کنویں میں کود کر جان دے دینے کا ارادہ کیا، مگر جب ان کی برائت میں وحی آئی تو سید صاحبؒ لکھتے ہیں کہ

"ماں نے کہا: بیٹی! شوہر کے قدم چوم لو، تو حضرت عائشہؓ نے نسوانی غرور اور ناز کے ساتھ جواب دیا: میں صرف اپنے خدا کی شکر گذار ہوں، کسی اور کی ممنون نہیں!" (ص ۸۲)

تحریم، ایلاء اور تخییر کے سلسلہ کا واقعہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ کے حجرہ سے متصل ایک بالا خانہ پر قیام کرکے یہ عہد کیا کہ ایک مہینہ تک ازواج مطہرات سے نہ ملیں گے، منافقین نے مشہور کردیا کہ آپؐ نے بیویوں کو طلاق دے دی، ازواج مطہرات روتی رہتیں، ان میں حضرت عائشہؓ بھی تھیں، ایک ایک روز گنتی تھیں، ۲۹ دن ہوئے، تو آپؐ بالا خانہ سے اتر آئے، سب سے پہلے حضرت عائشہؓ کے پاس تشریف لے گئے، حضرت عائشہؓ نے پھر اپنے ناز و ادا سے کام لیا، سید صاحبؒ لکھتے ہیں؛

انھوں نے عرض کی: یارسول اللہ! آپ نے ایک مہینہ کے لیے وعدہ فرمایا تھا، ابھی تو ۲۹ ہی دن ہوئے ہیں، ارشاد ہوا: مہینہ کبھی ۲۹ دن کا بھی ہوتا ہے۔ (ص ۹۵)

عام ازواج توسیع نان نفقہ کی طالب تھیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دامن کو زخارف دنیوی سے ملوث نہیں کرنا چاہتے تھے، اس پر تخییر کی آیت نازل ہوئی، یعنی جو بیوی چاہے فقر و فاقہ کو اختیار کرکے شرف صحبت سے ممتاز رہے اور دنیا کے بجائے آخرت کی نعمت پائے، اور جو چاہے کنارہ کش ہوکر دنیا طلبی کی ہوس پورے کرے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ وحی سنا کر حضرت عائشہؓ سے کہا:

"عائشہ! میں تمھارے سامنے یہ بات پیش کرنا چاہتا ہوں، اس کا جواب اپنے والدین سے مشورہ کرکے دینا!"

یہ سن کر حضرت عائشہؓ نے عرض کی: "یارسول اللہ! میں کس امر میں اپنے والدین سے مشورہ لوں، میں خدا اور اس کے رسول کو اختیار کرتی ہوں!"

یہ جواب سن کر آپ کے چہرے پر خوشی کے آثار نمایاں ہوئے، حضرت عائشہؓ نے عرض کی: یارسول اللہ! میرا جواب دوسری بیویوں پر ظاہر نہ ہو، ارشاد ہوا کہ میں معلم بن کر آیا ہوں، جابر بن کر نہیں آیا (ص ۹۶)

حضرت عائشہؓ کے ناز، ادا اور پیار کی ان باتوں پر تبصرہ کرتے ہوئے سید صاحبؒ رقمطراز ہیں:

"دریائے محبت کی بہت سی لہریں خالص نسوانی خصوصیات کے اندر پنہاں ہیں، ناز و انداز عورت کی فطرت ہے، اس قسم کے واقعات جو احادیث میں مذکور ہیں، لوگ ان کو قابل تنقید سمجھتے ہیں، وہ ان کو اس نظر سے دیکھتے ہیں کہ ایک امتی کا اپنے پیغمبر کے ساتھ یہ خطاب ہے،

اور اس کو بھول جاتے ہیں کہ ایک بیوی اپنے شوہر سے باتیں کر رہی ہے،

(ص ۴۵۰)

کاشانۂ نبوت کی ملکہ اور ناز و ادا سے کام لینے والی ناصرۂ اسلام کی مریم کی مرقع آرائی سید صاحبؒ نے یہ بھی کی ہے:

"حضرت عائشہؓ فرمایا کرتی تھیں کہ میں فخر نہیں کرتی، بلکہ بطور واقعہ کے کہتی ہوں کہ خدا نے مجھ کو نو باتیں ایسی عطا کی ہیں جو دنیا میں میرے سوا کسی اور کو نہیں ملیں، خواب میں فرشتے نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے میری صورت پیش کی، جب میں سات برس کی تھی تو آپؐ نے مجھ سے نکاح کیا، جب میرا سن نو برس کا ہوا تو رخصتی ہوئی، میرے سوا کوئی اور کنواری بیوی آپؐ کی خدمت میں نہ تھی، آپؐ جب میرے بستر پر ہوتے تب بھی وحی آتی، میں آپؐ کی محبوب ترین بیوی تھی، میری شان میں قرآن کی آیتیں اتریں، میں نے جبرئیل کو اپنی ان آنکھوں سے دیکھا، آپؐ نے میری ہی گود میں سر رکھے ہوئے وفات پائی۔"

(ص: ۱۶۲)

اس فخر اور پندار کے سامنے حضرت عائشہؓ کونین کی ساری دولت کو ہیچ سمجھتی رہیں تو تعجب کی بات نہیں۔

اس کتاب میں سید صاحبؒ کی تحریروں کے مختلف پہلو مختلف حیثیتوں سے دکھائی دیتے ہیں، جب وہ واقعۂ افک کے سلسلہ میں حضرت عائشہؓ کے کرب اور بے چینی کی مرقع آرائی کرتے ہیں تو اس کو پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دردناکی کی

پوری تصویر سامنے آگئی ہے، یا جب وہ جنگ جمل کا ذکر کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ کوئی ماہر جنگ اس کی تفصیل بیان کر رہا ہے، یا جب حضرت عائشہؓ قرآن مجید، حدیث پاک، کلام اور عقائد کے نکتے بیان کرتی ہیں تو ان کا قلم بھی رموز و نکات کا اداشناس ہو جاتا ہے، یا جب حضرت عائشہؓ درس و تدریس میں مشغول دکھائی دیتی ہیں تو ان کی تحریر میں مدرسانہ رنگ پیدا ہو جاتا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ کی زبانی ام زرعہ کا جو اخلاقی قصہ مذکور ہے، اس کی عبارت کا ایک ایک فقرہ، بلکہ ایک ایک لفظ عرب کی زبان اور ان کی تشبیہات و استعارات کا خالص نمونہ ہے، (ص ۲۴۷)، انھوں نے اسی قصہ کو جس طرح اردو میں دہرایا ہے، اس کو پڑھنے میں اردو داں ناظرین کو ویسی ہی لذت ملتی ہے، جیسی عربی دانوں کو ملتی ہوگی، (ص ۲۴۳ - ۴۱)

اس کتاب میں مختلف عنوانات سے حضرت عائشہؓ کی زندگی کے حالات اور کارنامے بہت ہی مرتب طریقے پر پیش کیے گئے ہیں، بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عربی میں یہ یکجا ہوں گے، جو اردو میں آسانی سے منتقل کر دیے گئے ہیں، لیکن یہ سارے معلومات احادیث میں بکھرے اور منتشر تھے، سید صاحبؒ نے اپنی خوش سلیقگی اور خوش مذاقی سے ان کو جمع کیا، اور ان میں تسلسل پیدا کر کے ان کو موتیوں کی لڑیاں بنا دیں۔

کتاب ختم کرنے کے بعد ناظرین محسوس کریں گے کہ اس کے مطالعہ سے ان کی زندگی کی ساعتیں کیسی خوشگوار اور دلآویز گذرتی رہیں، انھوں نے نہ صرف دنیا کی ایک بہت ہی جلیل القدر خاتون، ناصرۂ اسلام کی مریم اور کاشانۂ نبوت کی ملکہ اور فضل و کمال کے ایک بے مثال پیکر کے حالات پڑھے، بلکہ قرآن مجید، حدیث، فقہ اور کلام کے بہت سے

اسرار سے واقف ہو کر اپنے ایمان کی سلامتی اور ذہن کی جلا کا بھی سامان کرتے رہے، پھر جس مودب، متین، باوقار اور باعظمت اسلوب کے ساتھ پوری کتاب لکھی گئی ہے، اس سے بھی محظوظ ہوتے رہے، اور ان پر غیر شعوری طور پر یہ اثر ہوگا کہ جس انبساطی کیفیت کے ساتھ یہ لکھی گئی، اسی انبساطی کیفیت سے یہ پڑھ کر ختم کی گئی۔

سیرت عائشہ رضؓ

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ بنت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہا کے حالات زندگی، ان کے مناقب و فضائل و اخلاق، ان کے علمی کارنامے، دینی مسائل میں ان کے اجتہادات، اہم عصر صحابہ پر ان کی تنقیدات، صنف نسوانی پر ان کے گراں قدر احسانات، اسلام کے متعلق ان کی نکتہ سنجیاں اور معترضین کے جوابات، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اندرون خانہ زندگی کا ایک دلآویز مرقع، مولفہ مولانا سید سلیمان ندویؒ، قیمت ۱۹ روپیے۔

مولانا شبلیؒ پر ایک نظر

سید صاحب علیہ الرحمہ اپنی مایۂ ناز کتاب "حیات شبلیؒ" کے بعد مولانا شبلیؒ کے علمی کمالات اور قلمی کارناموں اور تصنیفات پر بھی ایک علیحدہ جلد لکھنا چاہتے تھے کہ وہ اپنے صاحب کمال استاد کے گوہر علم کے درحقیقت اصلی جوہری تھے، اور وہی لکھ بھی سکتے تھے، مگر اپنی گوناگوں علمی مشغولیتوں کی وجہ سے جس کا سلسلہ نفس واپسیں تک قائم رہا، اس کی طرف توجہ کرنے کا ان کو موقع نہ مل سکا، اور یہ دوسری جلد لکھنے سے رہ گئی، "مولانا شبلیؒ پر ایک نظر" ان کی اسی خواہش کی تکمیل ہے، شروع میں مولانا کی مختصر سوانح عمری ہے جو حیات شبلیؒ ہی کی روشنی میں لکھی گئی ہے، اس کے بعد مولانا کی تمام تصنیفات اور ان کے مذہبی، تعلیمی، تنقیدی، سوانحی، تاریخی، قومی و اخباری مضامین کے مجموعوں کا جو ۹ جلدوں میں ہیں تعارف اور تبصرہ ہے، قیمت ۱۵ روپیے، مولفہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن

"مدنیجر"

رودادِ اقبال

از
پروفیسر جگن ناتھ آزاد جموں کشمیر۔

(۲)

اقبال کی معنویت یا آج کے دور میں اقبال کی (Relevance) ایک ایسا سوال ہے جو کچھ مدت سے روپ بدل بدل کر بار بار ہمارے سامنے آرہا ہے، پاکستان میں بھی اور ہندوستان میں بھی، اس لئے اس پر بحث، وگفتگو کی ضرورت باقی ہے کہ اقبال کا کلام کس حد تک آج کے ماحول کا فکری اور فنی طور پر ساتھ دے رہا ہے۔

خاصی مدت ہوئی استاد محترم ڈاکٹر سید عبداللہ کا ایک مضمون میری نظر سے گزرا تھا، جس کا عنوان تھا، "اقبال صرف کل کے لیے ہی یا آج بھی"؛ اب موضوع پر یہ سطور لکھتے وقت ڈاکٹر سید عبداللہ کا مضمون تلاش بسیار کے باوجود مجھے نہیں مل سکا، حالانکہ اس موضوع پر قلم اٹھاتے ہوئے استاد محترم کے خیالات کو پیش نظر رکھنا ضروری تھا۔

میں سمجھتا ہوں کہ اقبال کو خود بھی اس بات کا احساس تھا، اور اس طرح کے مصرعے اور اشعار کہ

ع من نوائے شاعرِ فرداستم

ع دیکھتا ہوں دوش کے آئینے میں فردا کو میں

اور

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے
عکس اُس کا مرے آئینۂ ادراک میں ہے

صرف شاعرانہ تعلی ہی کی مثالیں نہیں ہیں، بلکہ اس بات کی بھی غمازی کرتے ہیں کہ اقبال اس دور کے ساتھ اپنا رشتہ برقرار رکھنے کے آرزومند تھے، جو ابھی معرضِ وجود میں نہیں آیا تھا، اور یہ آرزو ایک تڑپ بن کر ان کے دل میں موجود رہی، اس بات کا احساس صرف اقبال ہی کو نہیں تقریباً ہر بڑے شاعر کو رہا ہے، غالب کے یہاں یہی شدتِ احساس "میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں" بن کر ابھری

اقبال کے فکر کی گہرائی میں اترنے کے لیے The Reconstruction of Religious Thought in Islam کا مطالعہ ناگزیر ہے، اس کا مختصر سا دیباچہ ہمارے فکری ادب میں بہ قامت کہتر بہ قیمت بہتر کی ایک خوبصورت مثال ہے، میری ناقص رائے میں ایسی مثالیں ہمارے ادب اور فلسفے میں کم ہی ملیں گی۔ یہ دیباچہ

ع "من نوائے شاعر فرداستم"

کی تفسیر ہے اور اسے ایک نظر دیکھ کر یہ بات دل میں بیٹھ جاتی ہے کہ اقبال moderen Thought (جدید فکر) اور Modern Experience (جدید تجربہ) کو کتنی اہمیت دیتے ہیں، میں انگریزی کی یہ دونوں ترکیبیں اقبال ہی کے الفاظ میں استعمال کر رہا ہوں، وہ لکھتے ہیں۔

"صحیح قسم کے سلسلہ ہائے تصوف نے تو بے شک ہم مسلمانوں میں مذہبی احوال و واردات کی تشکیل اور رہنمائی میں بڑی قابل قدر خدمات سرانجام دی ہیں، لیکن آگے چل کر ان کی نمائندگی جن حضرات کے حصے میں آئی وہ عصرِ حاضر کے ذہن سے بالکل بے خبر ہیں، اور اس لیے موجودہ دنیا کے افکار اور تجربات سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکے۔"

اقبال کے نزدیک اس Modern mind اور Modern Thought کی اہمیت ہی "تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ" کے خاکے کا سبب بنی۔ چنانچہ اسی دیباچے میں وہ لکھتے ہیں۔

"یہ مطالبہ کیا غلط ہے، کہ مذہب کی بدولت ہمیں جس قسم کا علم حاصل ہوتا ہے،

اسے سائنس کی زبان میں سمجھا جائے، چنانچہ یہی مطالبہ ہے جسے ان خطبات میں جو مدراس مسلم ایسوسی ایشن کی دعوت پر مرتب ہوئے اور مدراس، حیدرآباد اور علی گڑھ میں دیے گئے ہیں نے اسلام کی روایاتِ فکر، علیٰ ہٰذا ان ترقیات کا لحاظ رکھتے ہوئے جو علم انسانی کے مختلف شعبوں میں حال ہی میں رونما ہوئیں، الٰہیات اسلامیہ کی تشکیل جدید سے ایک حد تک پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔"[۱]

اسی دیباچے میں آگے چل کے اقبال لکھتے ہیں۔

"اور وہ دن دور نہیں کہ مذہب اور سائنس میں ایسی ایسی ہم آہنگیوں کا انکشاف ہو جو ہنوز ہماری نگاہوں سے پوشیدہ ہیں۔"[۲]

مذہب اور سائنس میں ایک ہم آہنگی کے انکشاف کی توقع رکھنا ڈارونزم یا ماڈرنسی کو قابل رد یا قابل تعزیر سمجھنے کا نتیجہ نہیں، بلکہ اس کی اہمیت کو سمجھنے کا نتیجہ ہے۔

سیاسی طور پر اقبال کا اپنا دور ہندوستان کی غلامی کا دور تھا، غالباً ۱۹۳۱ء میں انڈین نیشنل کانگرس نے مکمل آزادی کا ریزولیوشن لاہور میں پاس کیا تھا، اقبال اسی زمانے میں جاوید نامہ لکھ رہے تھے، وہ جاوید نامہ کے اس باب میں جس کا عنوان ہے "عارفِ ہندی کہ بہ یکے از غارہائے قمر خلوت گرفتہ و اہل ہند او را جہاں دوست می گویند" کانگرس کے ریزولیوشن سے آگے نکل جاتے ہیں، اور انھیں مشرق کے متعدد ممالک کی زنجیر غلامی ٹوٹتی نظر آتی ہے، چنانچہ "جہاں دوست" رومی سے کہتے ہیں۔

دوش دیدم بر فرازِ قشمرود — زآسماں افرشتۂ آمد فرود
از نگاہش ذوقِ دیدارے چکید — جز بسوئے خاکدانِ ما ندید

[۱] و [۲] ترجمہ از سید نذیر نیازی۔ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ۔ ص اج

گفتمش از محرماں رازے مپوش	تو چہ بینی اندر آں خاکِ خموش؟
از جمالِ زہرۂ بگداختی؟	دل بہ چاہِ بابلے انداختی؟
گفت "ہنگامِ طلوعِ خاور است	آفتابِ تازہ اورا در بر است
لعلہا از سنگِ رہ آید بروں	یوسفانِ اُو ز چہ آید بروں
رستخیزے در کنارش دیدہ ام	لرزہ اندر کوہسارش دیدہ ام
اے خوش آں قومے کہ جانِ او تپید	از گلِ خود خویش را باز آفرید
عرشیاں را صبحِ عید آں ساعتے	چوں شود بیدار چشمِ ملتے[1]

---

[1] کل میں نے دیکھا کہ آسمان سے ایک فرشتہ قمر دو کی بلندی پر اُترا (قمر دو چاند کے پہاڑوں میں ایک پہاڑ کا فرضی نام ہے) اسکی آنکھوں سے ذوقِ دیدار ٹپک رہا تھا، اس نے ہماری زمین کے سوا اور کسی طرف نہیں دیکھا، (اقبال نے یہاں "خاکدانِ ما" کی ترکیب استعمال کی ہے، جس کا ترجمہ میں نے ہماری زمین کیا ہے، لیکن یہاں اس سے مراد ہے "ہندوستان" اور یہ مفہوم بعد کے اشعار سے جن میں سارا ذکر ہندوستان کی تحریکِ آزادی ہی کا ہے پوری طرح سے واضح ہو رہا ہے) میں نے اس سے کہا اپنے محرموں سے راز کو پوشیدہ نہ رکھ۔ تجھے اس خاکِ خموش کے اندر کیا نظر آ رہا ہے؟ کیا کسی زہرہ کے حسن و جمال نے تجھ کو پگھلا دیا ہے؟ کیا تو نے اپنا دل چاہِ بابل میں ڈال دیا ہے؟ (ہاروت و ماروت کی روایت کی طرف اشارہ ہے، روایت یہ ہے کہ یہ دو فرشتے زمین پر اس عزم کے ساتھ اُترے تھے کہ اہلِ زمین کے اخلاق اور چال چلن کی اصلاح کریں گے لیکن خود زہرہ نامی ایک رقاصہ کے عشق میں گرفتار ہو گئے اور اس جرم کی پاداش میں انھیں چاہِ بابل میں الٹا لٹکا دیا گیا تھا) اس نے جواب دیا کہ مشرق کے طلوع ہونے کا وقت آگیا ہے، اس کے پہلو میں اس وقت ایک آفتابِ تازہ موجود ہے، اسکے راستے کے پتھروں سے اس وقت لعل نمایاں ہو رہے ہیں، اس کے یوسف اس وقت کنوؤں سے باہر آ رہے ہیں، اس کے سینے میں بڑے بڑے ہنگامے دیکھ رہا ہوں، مجھے نظر آ رہا ہے کہ اسکے کہسار لرزہ براندام ہو رہے ہیں، مبارک ہو وہ قوم جس کی روح میں تڑپ پیدا ہو جائے، اور جو اپنی مٹی سے اپنے آپ کو دوبارہ پیدا کر سکے، ایسا لمحہ جب کہ کسی قوم کی آنکھ نیند سے بیدار ہو جائے ہم عرشیوں کے لیے صبحِ عید سے کم نہیں۔

یہ تو صرف ایک ہی مثال ہے، ان کی شاعری کے بیشتر حصے کے مزاج سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ ایک آزاد مشرق اور آزاد ہندوستان کی نمود کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

اقبال کے سامنے غلامی کی زنجیریں توڑنے کے لیے ترقی پسند طاقتیں سرگرمِ عمل تھیں، مہاتما گاندھی، محمد علی جوہر، موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو، ابو الکلام آزاد، سردار پٹیل، شیخ محمد عبداللہ، پنڈت مدن موہن مالوی، خان عبد الغفار خاں، یہ سب اسی دور کے نمائندے ہیں، اور اقبال نے ان رہنماؤں کا ذکر کہیں اشارۃً اور کہیں کھلم کھلا بڑے موثر انداز سے کیا ہے، یہاں ایک نظر اقبال کے فلسفۂ حیات پر بھی ڈالنا ضروری ہے، یوں تو ان کی ہر تصنیف خواہ وہ نظم میں ہو یا نثر میں، ان کے فلسفۂ حیات ہی کی تفسیر ہے، لیکن قرآنِ کریم پر تبصرہ کرتے وقت انھوں نے اپنا نظریۂ حیات ان دو فقروں میں قلمبند کر دیا ہے۔

قرآن مجید کی تعلیمات بھی جس کا یہ کہنا ہے کہ انسان عمل صالح اور قوائے طبیعی کی تسخیر پہ دسترس رکھتا ہے، رجائیت کی ہیں، نہ کہ قنوطیت کی بلکہ فلاح کی جس کا لب لباب یہ ہے، کہ کائنات اضافہ پذیر ہے، اور جس کو اس اُمید نے سہارا دے رکھا ہے کہ انسان ایک نہ ایک دن شر پر غالب آئے گا۔[1]

اور چند الفاظ پر مشتمل یہ دو فقرے اقبال کے فلسفۂ حیات کی جامع تفسیر ہیں، اور اپنے عہد کو ایک بیش قیمت دین ہے۔

اسی نظریۂ حیات میں اقبال کا اپنے عہد کے ساتھ تعلق پوری تابانی کے ساتھ نظر آتا ہے، خواہ وہ سیاسی دنیا میں ہو یا روحانی دنیا میں، خواہ سماجی دنیا میں اور خواہ معاشی دنیا میں، سیاست کی طرف

---

[1] ترجمہ از سید نذیر نیازی ــــــ تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ ــــ صفحہ ۱۲۳۔

The Reconstruction of Religious Thought in Islam - PP 81

ایک ہلکا سا اشارہ میں نے کیا ہے، اب میں فکر اقبال کے ایک اور پہلو کا ذکر کرنا چاہتا ہوں اور وہ ہے تصوف امیر خسرو اور غالب کی شاعرانہ عظمت سے انکار نہیں، جس موضوع کو ان شعراء نے ہاتھ لگایا ہے اُسے حیاتِ جاوداں بخش دی ہے، تصوف نے ہماری اُردو اور فارسی شاعری کیلئے ہمیشہ ایک پشت پناہ کا کام دیا ہے، اور صوفیانہ موضوعات ان شاعروں کے ہاتھ میں آ کر کہیں زیادہ تابناک اور خوشرنگ ہو گئے ہیں، لیکن جب امیر خسرو کہتے ہیں :-

کافرِ عشقم مسلمانی مرا درکار نیست — ہر رگِ من تار گشتہ حاجتِ زنّار نیست

یا غالب کہتے ہیں -

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم — ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

تو وہ اپنی بلند خیالی اور مضمون آفرینی کے باوجود بڑی حد تک تصوف کے اُسی دائرے میں محصور رہتے ہیں، جو ایک زمانے سے ہماری شاعری کی متاع چلا آ رہا ہے، لیکن اقبال جب کہتے ہیں.

گرچہ ہے میری جُستجو دیر و حرم کی نقشبند — میری فغاں سے رستخیز کعبہ و سومنات میں

تو وہ امیر خسرو اور غالب سے ایک قدم اور آگے جاتے ہیں، اور اپنی فغاں سے کعبہ اور سومنات میں رستخیز برپا کرتے ہوئے فکر کی انتہائی نازک منزلیں طے کرتے ہیں، اور اس انداز فکر کی بدولت وہ تصوف کو محض آرائش سخن ہی نہیں بناتے بلکہ اس کی مدد سے اپنے عہد کے دروازے پر دستک دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ سنو، میری جستجو نے دیر و حرم کی نقشبندی محض شاعری کے حسن کو دوبالا کرنے کے لیے نہیں کی اور نہ ہی میں نے کسی روایت کی محض پیروی کی ہے، بلکہ دیر و حرم کی نقشبندی مجھے اس مقام پر لے آئی ہے کہ میں ایک ایسے شخص کو جس کے نظام فکر میں خدا یا قادر مطلق کی کوئی گنجائش نہیں ہے، پیغمبر تسلیم کرتا ہوں اور اسے پیغمبروں کی صف میں جگہ دیتا ہوں اور اُس کا نام ہے گوتم بدھ، یہی انداز فکر اُس بحث کا، جس میں ہم آپ گرفتار ہیں خود فیصلہ کرتا ہے، اور ہمیں مرد کامل کے متعلق اس شعر سے آشنا کرتا ہے

پھر اُٹھی توحید کی آخر صدا پنجاب سے — ہند کو اک مردِ کامل نے جگایا خواب سے

اس کے بعد بھی اگر ہم اقبال کے تصور مرد کامل کو اک معما سمجھتے رہیں، تو یہ ہماری کم اندیشی بلکہ کور بینی ہے۔ اقبال جب کہتے ہیں۔

ع مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ

تو نہ جانے وہ لفظ "شاعری" کو کس معنی میں استعمال کرتے ہیں، لیکن اگر ہم اس مصرعے کو "ارمغان حجاز" کے ان اشعار کے ساتھ ملا کے پڑھیں تو مفہوم تک پہنچنے میں کوئی دقت پیدا نہیں ہونا چاہیے۔

مے من از تنک جاماں نگہدار — شرابِ پختہ از خاماں نگہ دار

شرار از نیستانے دور تر بہ — بخاصاں بخش و از عاماں نگہ دار [1]

یا بر آں قوم از تو می خواہم گشودے — فقیہش بے یقینے کم سوادے [2]

یا دگر دانائے راز آید کہ ناید [3]

یا زتاویلاتِ مُلّایاں نکوتر — نشستن با خود آگاہے دمے چند [4]

---

۱ (اے خدا!) میری شراب کو (یعنی ان روحانی حقائق کو جو میں نے بیان کیے ہیں) کم ظرف لوگوں سے محفوظ رکھ۔ (میری) شراب پختہ کو خام لوگوں سے (یعنی ایسے لوگوں سے جو روحانی حقائق سمجھنے کے قابل نہیں ہیں) محفوظ رکھ (میرا) شرار نیستاں (عام نااہل لوگوں) سے دور ہی رہے تو بہتر ہے، تو اسے خاص لوگوں کو (یعنی ان لوگوں کو جو میرے افکار کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور میرے شرار کے قابل ہیں) بخش دے اور عام لوگوں سے محفوظ رکھ!۔ ۲ میں تجھ سے دعا کرتا ہوں کہ اس قوم کو سربلندی نصیب کر جس کے فقیہ (بدقسمتی سے) یقین سے بھی محروم ہیں، اور علم آگہی سے بھی۔ ۳ (دیکھیں) کوئی اور دانائے راز (اس دنیا میں) آتا ہی یا نہیں۔
۴ کسی خود آگاہ کے ساتھ تھوڑی دیر بیٹھنا ملاؤں کی تاویلوں سے کہیں بہتر ہے۔

اگر ہم اس وہم میں گرفتار ہیں کہ اقبال نے عقل پر عشق کی برتری تسلیم کی ہے، یا اقبال عشق کو عقل کا تضاد سمجھتے ہیں تو یہ کلامِ اقبال کے ہمارے بے احتیاط مطالعے کا نتیجہ ہے۔ اوّل تو اقبال نے عشق اور عقل یعنی دانشِ نورانی کے درمیان کوئی حدِ فاصل نہیں کھینچی اور اس موضوع پر اس قسم کے مصرعے انھوں نے ہمیں دیئے ہیں۔

ع عشق صیقل می دہد فرہنگ را[۱]

اور

ع عقل ہم عشق است و از ذوقِ نظر بیگانہ نیست[۲]

دوسرے عقل کی برتری اور فضیلت کی اہمیت اقبال کی نظر میں بھی کم نہیں ہوئی بلکہ ان کا "عشق" دراصل "دانشِ نورانی" ہی کا ایک پہلو ہے، اسلوبِ بیان کی بات دوسری ہے۔ "تشکیلِ جدیدِ الٰہیاتِ اسلامیہ" خرد اور فکر کی تجلّی سے جگمگا رہی ہے، اور اقبال کا یہی اندازِ فکر ہے، جس کی بدولت اُن کی ملاقات بھرتری ہری کے ساتھ بہشت میں ہوتی ہے۔ "جاوید نامہ" میں سید جمال الدین افغانی اور سید حلیم پاشا کا مقام بہشت نہیں ہے، لیکن شاہ ہمدان اور غنی کاشمیری کے ساتھ ہی بھرتری ہری بہشت میں موجود ہیں۔

میں مفکرین کو ہندو اور مسلمان کے زمرے میں تقسیم نہیں کرتا لیکن یہاں بات ذرا سخن گسترانہ آپڑی ہے اور یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ مسلمان مفکرین میں اقبال پہلے مفکر ہیں جنھوں نے بڑے حوصلے سے یہ بات کہی کہ پچھلے پانچ سو برس سے الٰہیاتِ اسلامیہ پر جمود کی ایک کیفیت طاری ہے۔[۳]

اس مسئلے پر بحث کرتے ہوئے، اقبال نے پھر ایک حوصلہ مندانہ بات کہی ہے جس کی توقع کسی اور سے کم ہی ہو سکتی تھی۔

۱؎ عشق عقل کو جلا بخش دیتا ہے۔ ۲؎ عقل بھی عشق ہے، اور ذوقِ نظر سے بیگانہ نہیں ہے،

۳؎ ترجمہ از سید نذیر نیازی۔ تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ ص ۱۱ - The Reconstruction of Religious Thought in Islam (P. 7)

"معلوم ہوتا ہے عقلِ انسانی زمان و مکاں اور علیت ایسے بنیادی مقولات کی دنیا سے بھی آگے نکل جائے گی، پھر جوں جوں افکار ترقی کر رہے ہیں، انسانی علم و ادراک کے متعلق بھی ہمارے تصورات بدل رہے ہیں، آئن اسٹائن کے نظریے نے کائنات کو ایک نئے روپ میں پیش کر دیا ہے، اور ہم محسوس کر رہے ہیں کہ اس طرح ان مسائل پر بھی جو فلسفہ اور مذہب میں مشترک ہیں نئے نئے زاویوں کے ماتحت غور کرنا ممکن ہو گیا ہے، لہٰذا اگر اسلامی ایشیا اور افریقہ کی نئی پود کا مطالبہ ہے کہ ہم اپنے دین کی تعلیمات پھر سے نمایاں کریں تو یہ کوئی عجیب بات نہیں، لیکن مسلمانوں کی اس تازہ بیداری کے ساتھ اس امر کی آزادانہ تحقیق نہایت ضروری ہے، کہ مغربی فلسفہ ہے کیا، علیٰ ہذا یہ کہ الٰہیاتِ اسلامیہ کی نظرِ ثانی بلکہ ممکن ہو تو تشکیلِ جدید میں ان نتائج سے کہاں تک مدد مل سکتی ہے، جو اس سے مترتب ہوں۔"[۱]

ایشیا اور افریقہ کے نوجوان مسلمانوں کا یہ اضطراب ۱۹۲۸ء میں "تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ" کے قاری کو کہاں نظر آیا ہوگا، اقبال تو دوش کے آئینے میں فردا کو دیکھ رہے تھے، اور یہ وہی فردا ہے جو آج ایشیا میں طلوع ہو رہی ہے، اور جسے ہم آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے۔

کھول کر آنکھیں مرے آئینۂ گفتار میں ۔۔۔ آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ

تو یہ دو ایک اقتباسات پیش کرنے سے میری مراد یہ ہے کہ اقبال کا تعلق اپنے عہد کے ساتھ ایک باغی وقت کا تعلق تھا، یہ تعلق ایک ڈاکٹر اور مریض کا تعلق بھی تھا، ایک ایسا ڈاکٹر جو ایکسرے کے نتائج دیکھنے میں انتہائی ماہر ہے۔ اور اس کا اظہار اقبال نے اپنے اس طرح کے اشعار میں کیا ہے۔

گفتند جہانِ ما آیا بتو می سازد ۔۔۔ گفتم کہ نمی سازد گفتند کہ برہم زن[۲]

۱؎ ترجمہ سید نذیر نیازی ۔۔۔ تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ - ص ۱۱ - ۱۲ - The Reconstruction of Religious Thought in Islam صفحہ ۸

۲؎ انھوں نے (قضا و قدر کے فرشتوں نے) مجھ سے پوچھا "کیا ہمارا جہان تجھے سازگار آ رہا ہے؟" اس نے جواب دیا کہ نہیں، انھوں نے کہا کہ اسے درہم برہم کر دے!

چہ عصر است ایں کہ دین فریادی اوست
ہزاراں بند در آزادیِ اوست

زروئے آدمیت رنگ و نم برد
غلط نقشے کہ از بہزادیِ اوست[۱]

پختہ افکار کہاں ڈھونڈنے جائے کوئی
اس زمانے کی ہوا رکھتی ہے ہر چیز کو خام

مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر
چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام

مردہ لادینیِ افکار سے افرنگ میں عشق
عقل بے ربطیِ افکار سے مشرق میں غلام

اقبال نے اسی بے ربطی افکار کی تشکیلِ جدید کر کے اسے بار ربط بنانے کی کوشش کی ہے۔

۱۹۷۷ئہ میں جب میں کرناٹک یونی ورسٹی میں اپنا ایک مقالہ پڑھ رہا تھا "انسان اقبال کے نظام فکر میں"۔ اور اس میں. میں نے The Reconstruction of Religious Thought in Islom کے صفحہ نمبر ۱۲۳ پر مندرج اقبال کا یہ جملہ اپنے ایک اقتباس میں شامل کیا کہ Heaven and Hell are States not localities۔ تو سوال وجواب کے وقت ایک صاحب نے کہا کہ کلام پاک میں جنت اور دوزخ کو مقامات یعنی جگہیں (localities) کہا گیا ہے، اقبال نے اگر بقول آپ کے کہا ہے کہ یہ localities نہیں ہیں۔ States ہیں تو ایسا کیوں کہا ہے. میں نے کہا کہ یہی تو میرا سوال ہے، اور اسی کو اقبال The Reconstruction of Religious Thought in Islam میں کہتے ہیں، اقبال اگر قرآن پاک کی ان آیات کے بارے میں جن میں دوزخ اور جنت کا ذکر آیا ہے یہ لکھتے ہیں Heaven and Hell are States, not localities. The descriptions in

---

[۱] کیسا زمانہ ہے کہ مذہب اس سے نالاں ہے، اسکی آزادی میں یہ غلامیاں پوشیدہ ہیں، اس غلط نقش نے جو اس دور کی بہزادی نے پیدا کیا ہے، آدمیت کے چہرے سے رنگ و نم کو ختم کر دیا ہے۔

The Quran are visual Representations of an inner Fact, i, e, Charecter. Hell, in Words of Quron is God's Kindled fire which moints above The hearts, — The Painful Realization of one's failure as a man. Heaven is The Joy of Triumph over The forces of disintegration There is no Such Thing as eterveal damnation in Islam. The word eternity used in certain verses, Relating to Hell, is explained by The Quran itself to mean only a period of time (78:23)

تو یہ علمائے اسلام کا فرض ہے، کہ کلام پاک کے اس حصے کی تفسیر کا جو اقبال نے کی ہے۔

---

[۱] جنت اور دوزخ اس کے احوال ہیں، وہ کسی مقام یا جگہ کے نام نہیں ہیں، چنانچہ قرآن پاک میں ان کی جو کیفیت بیان کی گئی ہے اس سے مقصود بھی یہی ہے کہ ایک داخلی حقیقت، یعنی انسان کے اندرونی احوال کا نقشہ اس کی آنکھوں میں پھر جائے، جیسا کہ دوزخ کے بارے میں ارشاد ہے، اللہ کی جلائی ہوئی آگ جو دلوں تک پہنچتی ہے بالفاظ دیگر وہ انسان کے اندر بحیثیت انسان اپنی ناکامی کا دردانگیز احساس ہے، جیسے بہشت کا مطلب ہے فنا اور ہلاکت کی قوتوں پر غلبے اور کامرانی کی مسرت۔ اسلام نے انسان کو ابدی لعنت کا مستحق نہیں ٹھہرایا، چنانچہ قرآن مجید نے لفظ "خلود" کی تشریح بھی دوسری آیات میں اس طرح کر دی ہے کہ اس سے مراد محض ایک مدت زمانی ہے (۷۸-۲۳)

جائزہ لیں اور صرف عربی صرف و نحو ہی کی روشنی میں نہیں، بلکہ قرآن کے تفکر اور تدبر کی روشنی میں اس بات پر غور کریں کہ اقبال نے جو مفہوم پیش کیا ہے، اُس کی کیا قدر و قیمت ہے۔ آخر کوئی بات تو تھی جس کے پیشِ نظر اقبال نے صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کو ایک خط میں یہ لکھا تھا کہ ان دونوں ایک کتاب لکھ رہا ہوں جس کا نام ہوگا
The Recons Tru- یہی وہ کتاب ہے جو آج Islam as. anderstandit.
ction of Religuous Tought in Islom کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔

اسی کے ساتھ ہی مسئلہ اقتناعِ نظر کی بحث اقبال کی نظم و نثر میں دیکھئے۔ خطوط میں، جاوید نامہ میں تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ میں یہ بحث ہر جگہ موجود ہے۔ غالب نے اس بحث کو جہاں چھوڑا تھا، اقبال نے اسے وہاں سے شروع کیا، اور جہاں تک اسے لے جا سکتے تھے لے گئے۔

یہ چند اشارے سیاست اور مذہب کے تعلق سے تھے، جہاں تک ادب اور شاعری کا تعلق ہے، میں یہ سمجھتا ہوں کہ ادب کی ترقی پسند تحریک ابتدا سے انتہا تک ٹیگور اور اقبال کے فکر و فن کی مرہونِ منت ہے۔ سجاد ظہیر اقبال کے ساتھ ملاقات سے متاثر ہوئے ہوں یا نہ ہوئے ہوں، یہ بات دوسری ہے، یہ بات بھی سمجھ میں آ سکتی ہے کہ انھوں نے اقبال کی شاعری کے اکثر حصوں سے اختلاف بھی کیا، ہم بھی اختلاف کرتے ہیں اور میں نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ میں اقبال کو اوّل سے آخر تک قبول کرتا ہوں۔ خود اقبال نے سارے کے سارے رومی کو قبول نہیں کیا، لیکن اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ پریم چند کی نثر اور اقبال کی شاعری کو اپنائے بغیر ادب میں ترقی پسند تحریک کی بنیادیں کمزور ہی رہتیں۔ زندگی اور فن کے تعلق سے ساری ترقی پسند تحریک میں اس طرح کی اردو یا فارسی شاعری کہاں ملے گی۔

رنگ ہو یا خشت و سنگ چنگ ہو یا حرف و صوت — معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود
قطرۂ خونِ جگر سِل کو بناتا ہے دل — خونِ جگر سے صدا سوز و سرور و سرود

ہر چند کہ ایجادِ معانی ہے خداداد — کوشش سے کہاں مردِ ہنرمند ہے آزاد
خونِ رگِ معمار کی گرمی سے ہے تعمیر — میخانۂ حافظ ہے کہ بتخانۂ بہزاد
بے محنتِ پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا — روشن شررِ تیشہ سے ہے خانۂ فرہاد
دلبری بے قاہری جادوگری است — دلبری با قاہری پیغمبری است[1]
گر ہنر میں نہیں تعمیرِ خودی کا جوہر — وائے صورت گری و شاعری و نائے و سرود
وہ نغمہ سردیِ خونِ غزل سرا کی دلیل — کہ جس کو سن کے ترا چہرہ تابناک نہیں

مشرق کے نیستاں میں ہے محتاجِ نفس نے — شاعر! ترے سینے میں نفس ہے کہ نہیں ہے

صرف یہی نہیں بلکہ سرمایہ و محنت کی آویزش بھی اقبال سے قبل ہماری شاعری میں کہاں ملتی ہے۔

اقبال کا عہد مغربی تہذیب کی عملداری کا عہد تھا، اور اقبال نے مغربی سامراج کے ہتھکنڈوں پر اپنی نظم و نثر میں مکمل وار کیا ہے، لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ انھیں یورپ سے نفرت ہے، یورپ کی تہذیب میں جہاں خرابیاں ہیں، وہاں خوبیاں بھی ہیں، اقبال ان خوبیوں کا اعتراف بھی کرتے ہیں، انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ میری زندگی کا بیشتر حصہ یورپی فلسفے کے مطالعے میں صرف ہوا ہے، اور یہ نقطۂ نگاہ میری فطرتِ ثانیہ بن گیا ہے، شعوری یا غیر شعوری طور پر میں حقائق اسلام کا مطالعہ اسی نقطۂ نگاہ سے کرتا ہوں۔

اب آخر میں ایک ذرا سا اشارہ میں اقبال اور اس کے عہد کی اُردو شاعری کی طرف کر کے اپنی بات چیت کو ختم کر دوں گا، اس کے لئے اپنے ہی ایک پرانے مقالے کا ایک اقتباس کسی قدر اضافے کے ساتھ میں یہاں پیش کر رہا ہوں۔

---

[1] دلبری قاہری کے بغیر جادوگری (کے سوا اور کچھ نہیں ہے) اور یہی دلبری اگر اس کے ساتھ قاہری شامل ہو جائے تو پیغمبری بن جاتی ہے۔

"اقبال نے انسان کے اندر قوتِ یقین پیدا کرنے کی جو کوشش کی ہے وہ ہماری شاعری میں مربوط سلسلۂ فکر پر مبنی اولین کوشش ہے۔ اقبال اگر اُردو اور فارسی شاعری کو اس موڑ سے آشنا نہ کرتے تو آج جوشؔ ملیح آبادی، مجازؔ، احسانؔ دانش اور سردارؔ جعفری کی شاعری کا انداز یقیناً مختلف ہوتا۔ جوشؔ کو شاعرِ انقلاب بنانے میں اس ماحول کا بڑا ہاتھ ہے، جو اقبال کے فکر و فن کی بدولت وجود میں آیا۔ اقبال کی صدائے بازگشت ہمیں صرف نظم گو شعراء کے کلام ہی میں نہیں سنائی دیتی بلکہ غزل گو شعراء بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے، جگرؔ کی یہ مشہور غزل

جو دلوں کو فتح کر لے وہی فاتحِ زمانہ

صرف موضوع ہی کے اعتبار سے نغمۂ اقبال کی صدائے بازگشت نہیں بلکہ اس میں الفاظ اور ترکیبیں بھی قریب قریب وہی ہیں، جنھیں اقبال بہت پہلے سے استعمال کر رہے ہیں۔[۱] یہ بات صرف جگرؔ صاحب ہی کی غزل پر ختم نہیں ہو جاتی، دورِ جدید کی وہ تمام قابلِ ذکر غزلیں جن میں ہم براہِ راست اندازِ بیان کی غزل کہہ سکتے ہیں، خواہ وہ مجروحؔ کی غزل ہو، یا تاباںؔ کی، خواہ مخمورؔ سعیدی کی، خواہ بانیؔ کی، اس وقت میرا خیال بانیؔ کی اس غزل کی طرف جا رہا ہے۔

اے ستارو! اس خلا میں اک سفر میرا بھی ہے

اس غزل کا آہنگ اور مفہوم دونوں مجھے نغمۂ اقبال کی یاد دلاتے ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ اقبال کا نغمہ انسان کے خلائی سفر سے پہلے کا ہے، اور بانیؔ کا اس خلائی سفر کے بعد کا۔ یہاں سوال ایک آدھ غزل کا نہیں ہے، بلکہ ساری غزلیہ شاعری کو ایک نئے رجحان سے آشنا کرنے کا ہے۔ اقبال سے پہلے ہماری غزل محض ایک انفعالی کیفیت کے گرد گھوم رہی تھی، اقبال نے آکر اسے غنائیت میں رچا ہوا ایک باوقار لہجہ عطا کیا، غزل کی داخلیت کو برقرار رکھتے ہوئے اقبال نے

[۱] "اقبال اور اس کا عہد" (جگن ناتھ آزاد) ادارۂ انیس اردو الہ آباد۔ تیسرا ایڈیشن ص ۱۰۹-۱۱۰۔

اسے مسائلِ حیات سے آشنا کیا، اور اسے گھٹے ہوئے تعفن آمیز ماحول سے نکال کر کھلی فضا میں سانس لینے کی توفیق بخشی۔[۱] یہ کہنا تو شاید صحیح نہیں ہوگا کہ اقبال اگر غزل کو اس لب و لہجہ سے آشنا نہ کرتے تو ہمیں فیضؔ، راشدؔ اور احمد ندیم قاسمی کی شاعری نظر نہ آتی، لیکن قیاس یہی ہے کہ فیضؔ، راشدؔ اور قاسمی کے آنے میں ابھی ایک زمانہ اور گزر جاتا۔

اس کتاب میں جس کا ایک حصہ اس مضمون کی صورت میں نذرِ قارئین کیا گیا ہے، اقتباسات کہیں کہیں بہت طویل ہو گئے ہیں، بالعموم طویل اقتباسات کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا لیکن اس ضمن میں میرے سامنے دو مقاصد تھے، مثلاً اقبال کی زندگی کے بعض غیر معروف پہلوؤں پر بعض حضرات نے قابلِ قدر کام کیا ہے، ان کے کام کو مختصر طور پر اپنے لفظوں میں بیان کر کے خود اس کا کریڈٹ لینا نہ تحقیق کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے، نہ اخلاق کے تقاضوں کو، میں نے اس سے اجتناب کیا، یہاں میں صرف دو مثالیں پیش کروں گا، غلام نبی ناظر (سری نگر) اور محمد یوسف ٹینگ (سری نگر) نے اقبال کے آبائی گاؤں کے تعلق سے خاصی چھان بین کی ہے اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اقبال کے اجداد سپر نامی گاؤں کے رہنے والے تھے، اس ضمن میں غلام نبی ناظر کے کام کی تمام جہتیں اسی صورت میں قاری کے سامنے آسکتی ہیں، جب اُن کے کام کو تفصیل سے پیش کیا جائے، اور جب تفصیل سے پیش کرنا ہے تو انہی کے الفاظ میں اور ان ہی کے حوالے سے کیوں نہ ہو۔ دوسری مثال اقبال کی بی۔ اے اور ایم۔ اے کی تعلیم کے متعلق ہے، اس سلسلے میں اقبال کے امتحانات کے صحیح نتائج کی تلاش میں ڈاکٹر وحید قریشی (لاہور) اور ڈاکٹر ذوالفقار حسین ملک (لاہور) نے پنجاب یونیورسٹی لاہور کے سال بہ سال پرانے کیلنڈر اور امتحانات کے نتائج کھنگال ڈالے، ڈاکٹر حسن اختر (لاہور) نے پنجاب گورنمنٹ گزٹ کے متعدد مجلدات کی ورق گردانی کی اور اقبال کے نتائج امتحانات کے بارے میں بعض ایسے حقائق ہمارے سامنے رکھے جو

[۱] "اقبال اور اس کا عہد" (جگن ناتھ آزاد) ص ۱۱۰۔

ان کی تحریروں سے پہلے ایک طرح سے نایاب تھے، اب ان حضرات کا یہ کام ایسا نہیں ہے کہ میں اس کا اختصار چند لفظوں میں پیش کر دوں، چند لفظوں میں ان تمام کو ائف کا اختصار پیش کرنے سے ایک ادھوری تصویر ہی سامنے آتی اور اقبال کی بی۔ اے اور ایم۔ اے کی تعلیم کے خد و خال ہمارے سامنے نہ ابھر سکتے۔

اس کتاب میں طویل اقتباسات شامل کرنے کا ایک سبب اور بھی ہے، اور وہ یہ کہ میں قاری کو اس زحمت سے بچانے کا آرزو مند ہوں کہ کسی پہلو یا کسی واقعے کی طرف محض اشارہ کر دینے کے بعد میں حاشیے میں یہ لکھ دوں کہ تفصیل کے لیے فلاں کتاب، مطبوعہ شہر فلاں ڈاک فلاں، ناشر فلاں اور سنہ اشاعت فلاں ملاحظہ کیجئے۔ ایک ریسرچ اسکالر جب پی ایچ ڈی یا ڈی لٹ کے لیے تحقیقی مقالہ لکھتا ہے، تو اسے اس طرح کے حوالے ڈھونڈنے کے لیے مختلف لائبریریوں میں جاکر اپنی آنکھوں کی روشنی اندھیرے اُجالے کی نذر کرنا پڑتی ہے لیکن ایک علمی اور ادبی مذاق رکھنے والے عام قاری کے لیے یہ سب ممکن نہیں، ہر قاری سے یہ توقع کرنا کہ وہ کسی کتاب کو پوری طرح سے سمجھنے کے لیے یا اس سے پوری طرح لذت اندوز ہونے کے لیے اُن بیسیوں کتابوں کی ورق گردانی بھی کرے، جن کا ایک جگہ پر دستیاب ہونا ممکن ہی نہیں، اسے مشکل میں ڈالنا ہے۔

اور یہ کتاب ہند و پاکستان کے محبوب ترین شاعر کی سوانح حیات ہے، یہ سوانح حیات انتہائی مختصر طور سے بھی بیان کی جاسکتی تھی جیسے اقبال نے اپنے اس مصرعے میں کہا ہے۔

بہ حرفے می تواں گفتن تمنائے جہانے را

لیکن میرے سامنے اس تصویر کا دوسرا پہلو تھا، چنانچہ میں نے اقبال کے اسی شعر کے دوسرے مصرعے کا سہارا لیا، اور نتیجۃً

من از ذوقِ حضوری طول دادم داستانے را

مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ کا کچھ غیر مطبوعہ کلام

از پروفیسر سید امیر حسن عابدی، دہلی یونیورسٹی

عرصہ ہوا میں نے ایک سفر میں دار المصنّفین کے کتب خانہ میں دو جلدوں میں ایک ضخیم بیاض دیکھی تھی، اور جی چاہتا تھا کہ اس کا بغور مطالعہ کیا جائے، جناب صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب سے ہر ملاقات میں تقاضا کرتا تھا کہ کسی طرح کچھ دنوں کے لیے بطور امانت عاریۃً مل جائے، اور مجھے اعظم گڈھ جاکر رکنے اور پڑھنے کی زحمت نہ اٹھانا پڑے، اس لیے کہ صرف اس کا پڑھنا ہی کافی نہیں ہے، جب تک اس سے متعلق دوسری کتابیں بھی ہمراہ نہ ہوں، بہرحال میں انکا اور ادارہ کا بے حد شکر گذار ہوں کہ میری درخواست قبول ہوئی، اور مجھے اس کے بالاستیعاب مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔

اس بیاض کے متعلق میں دو مضمون لکھ چکا ہوں، جو "غالب نامہ"[1] اور "دانش"[2] میں شایع ہو چکا ہے۔ بد قسمتی سے جیسا کہ ان مضامین میں لکھ چکا ہوں، یہ بیاض کامل نہیں ہے، بلکہ صرف پہلا حصہ باقی رہ گیا ہے، اور وہ بھی خراب حالت میں ہے، نیز جیسا کہ پہلے لکھا جاچکا ہے اس کے مولف کا پتہ نہیں چلتا، البتہ اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ یہ بیاض ہندوستان میں بارہویں صدی ہجری کے نصف دوم یعنی اٹھارہویں صدی عیسوی میں تیار ہوئی تھی۔

---

[1] غالب نامہ صفحہ ۱۸۰ - ۲۰۲ جولائی ۱۹۸۲ء غالب انسٹیٹیوٹ، نئی دہلی۔ [2] دانش (ص ۶۵-۸۱) فصلنامۂ رایزنی، فرہنگی جمہوری اسلامی ایران اسلام آباد۔ بہار ۱۹۸۵ء۔

اس قسم کی بیاضوں کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ ان میں فارسی کے بڑے شعراء کا ایسا کلام مل جاتا ہے، جو ان کے مطبوعہ دیوانوں اور کلیات میں اب تک شامل نہ ہو سکا۔ اسی قسم کے کئی سفینوں اور بیاضوں کا تعارف کرایا جا چکا ہے، دارالمصنفین کی بیاض میں بھی بہت سا ایسا کلام ملا ہے، جو پہلی مرتبہ قلمی نسخہ سے نکل کر منظر عام پر آیا ہے، اور آئندہ آسکے گا۔

ناصر خسرو، عمر خیام، ادیب صابر ترمذی، رشید وطواط، جمال الدین عبدالرزاق، عطار، عراقی، سعدی، امیر خسرو دہلوی، حسن سنجری، حافظ، مسعود سعد سلمان، امیر معزی، خلاق المعانی کمال الدین اسمٰعیل، اوحدی مراغہ ای، ابن یمین، سلمان ساوجی کا غیر مطبوعہ کلام پچھلے مقالوں میں دیا جا چکا ہے، یہاں صرف مولانا جامی کا وہ کلام پیش کیا جا رہا ہے، جو ان کے دیوان کے مطبوعہ نسخوں میں دکھائی نہیں دیتا۔

غزلیات

بر دن خرام کہ تا در رہ تو خاک شوم — رو امدار کزین آرزو ہلاک شوم

ہر دم از کوی تو خواہم من شیدا بردم — جان سپارم بسگانت تن تنہا بردم

می شوم باز پریشان کہ نہ مقدور من است — کہ بجائی کہ تو باشی من از آنجا بردم

عشق من با تو قدیم است نہ چون دگران — کایم امروز بکوی تو و فردا بردم

نگارا بر گرفتاران ببخشای — خدا را بر گرفتاران ببخشای

کہ ایارا کہ گوید با تو یارا — کہ یارا بر گرفتاران ببخشای

مقطعات

چہ شعر یست انیکہ چون نامش زدانا — ببرس بر زبانش لرزہ آید

[1] نورالدین عبدالرحمٰن جامی، وفات ۸۹۸ھ ۱۴۹۲-۹۳ء

دگر بہ شربت بیمار خوانی — تپ محرق رود تپ لرزہ آید

ز آمیزش جسم و آلایش آن — چنان گشتی از جوہر خویش غافل

کہ جان را بصد فکرت از تن ندانی — زہی فکر باطل زہی جہل کامل

دنیا چہ کنی جمع کہ مقصود ز دنیات — دلقی کہن و نانی و باقی ہمہ فاضل

ناکامی و رنج است ہمہ حاصل دنیا — در کام شود حاصل از و نیز چہ حاصل

آدمی زادہ طرفہ معجونیست — از فرشتہ سرشتہ وز حیوان

گر کند میل این بود کم ازین — ور کند میل آن شود بہ از آن

جامی کہ نامۂ عملش را نیامدہ — عنوان بغیر مظلمہ مضمون بجز گناہ

موی سیاہ را بہوس می کند سفید — روی سفید را بگنہ می کند سیاہ

. . . .

حالش تپ ندامت و آہ مخالف است — ہرگز مباد حال کسی اینچنین تباہ

عربی از دکان طباخی — چرب رودی خرید اندر ری

در بغل کرد تا بخانہ برد — وقت رفتن فرو فتاد از وی

نام آن را نکو نمی دانست — ہر طرف می دوید اندر پی

... (در) کف نہادہ و می گفت — بل وجدتم بمثل ہذا الشئی

رباعیات

ای آنکہ بقبلۂ وفا روست ترا — بر مغز چرا حجاب شد پوست ترا

دل در پی این و آن نہ نیکوست ترا — یک دل داری بس است یک دوست ترا

ای بلبل جان مست ز یاد تو مرا — وی مایۂ غم پست ز یاد تو مرا

لذاتِ جہان را ہمہ در پا فگند   ... دست زیاد تو مرا

این عشق کہ ہست جزو لاینفک ما   حاشا کہ بود بعقل مادرک ما
خوش آنکہ دمد ز نور او صبح یقین   ما را برہاند از ظلام شکِ ما

انسان متمر خیل بداندیشان را   کان مرتبہ نیست این دغاکیشان را
از خامۂ صنع بر سرِ لوحِ وجود   جز صورت انسان بنود ایشان را

ای خواجہ اگر مال وگر فرزند است   پیداست کہ مدت بقایش چند است
خوش آنکہ دلش بدلبری دلبند است   کش با دل و جان اہل دل پیوند است

از ما ہمہ عجز و نیستی مطلوب است   ہستی و توابعش ز ما مسلوب است
این اوست پدید آمدہ در صورت ما   این قدرت و فعل از آن بما منسوب است

آوردہ صبا نامۂ مشکین رقمت   شد روضۂ جان تازہ ز رشح قلمت
من فرد جواب آن نیم لیک مرا   انداخت درین ورطہ کمال کرمت

ز آندم کہ فتاد اتفاق سفرت   تا بو کہ کنم گہی بخاطر گذرت
مرغ سپرد سوی تو یاد در زد   خواہم کہ بنامۂ دہم در دسرت

از من زندشاعری بناتی می خواست   گفتم ز متاع در دچیزی کہ مراست
یک خانہ چپ دارم و یک خانۂ راست   پیداست کزین میان چہ خواہد برخاست

مجنون بزبانِ حال دایم در دشت   لیلی گویان چہ گرد بادی می گشت
می گشت ہمیشہ بر زبانش لیلی   لیلی می گشت تا زبانش می گشت

آنجا کہ کمالِ کبریائی تو بود   عالم نمی از بحر عطای تو بود
ما را چہ حد حمد و ثنای تو بود   ہم حمد و ثنای تو سزائی تو بود

ای دل طلبِ کمال در مدرسہ چند   تکمیل حصول حکمت و ہندسہ چند
ہر فکر کہ جز فکر خدا وسوسہ است   شرمی ز خدا بدار این وسوسہ چند

چون خور ز فروغ خود جہان آراید   بر پاک و پلید اگر بتابد شاید
نی نور وی از ہیچ پلید آلاید   نی پاکی او ز ہیچ پاک افزاید

ہر چند کہ جان عارف آگاہ بود   کی در حرم قدس تو اش راہ بود
دست ہمہ اہل کشف و ارباب شہود   از دامن ادراک تو کوتاہ بود

جامی تن زن سخن طرازی تا چند   افسون گری و فسانہ سازی تا چند
اظہار حقایق بسخن ہست خیال   ای سادہ دل این خیال بازی تا چند

نی دولت آنکہ دیدہ رویش نگرد   نی قوت پا کہ رہ بکویش سپرد
ای کاش رساند خبری قاصد ازو   تا یک دو نفس بہ گفتگویش گذرد

جامی الف است احد از وجہی مدد   وانگہ بشمار بنیاتش ؟ بعدد
بنگر کہ علیست والعلی سر اللہ   از قال اللہ قل ہو اللہ احد

مہ را بینم روی توام یاد دہد   گل را بویم بوی توام یاد دہد
چون زلفِ بنفشہ را زند برہم باد   آشفتگی موی توام یاد دہد

در زندۂ فقر عیب پوشی بہتر   در نکتۂ عشق تیز ہوشی بہتر
چون برِ رخ مقصود نقاب است سخن   از گفت و شنید ما خموشی بہتر

رفتی تو و از دولت دیدار تو دور   ہم دیدہ ز نور ماند و ہم دل ز سرور
خوش آنکہ شود ز دور ایام شہود   این غیبتِ ما بدل بہ تشریف حضور

رفتم بتماشائی گل آن شمع طراز   چون دید میان گلشنم گفت بناز

من اصلم و گلهای چمن فرع من است　　از اصل چرا بفرع می مانی باز

تا کی چو داری کردن فغان و خروش　　یک دم شو ازین هرزه سرائی خاموش

گنجینۂ درهای حقایق نشوی　　مادام که چون صدف نگردی همه گوش

گشتی بوقوف بر مواقف قانع　　شد قصد مقاصدت ز مقصد مانع

هرگز نه شود تا نکنی کشف حجب　　انوار حقیقت از مطالع طالع

مجموعۂ کون را بقانون سبق　　کردیم تصفح ورقاً بعد ورق

حقا که ندیدیم و نخواندیم درو　　جز ذات حق و شیون ذاتیۂ حق

رخ گرچه نمی نمائیم سال بسال　　حاشا که بود مهر ترا بیم زوال

دارم همه جا با همه کس در همه حال　　در دل ز تو آرزو و در دیده خیال

من کیستم اندر چه شمارم چه کسم　　تا همسری سگانش باشد هوسم

در قافلۂ که اوست دانم نرسم　　این بس که رسد ز دور بانگ جرسم

با کلک تو گفت نامه کای گاه خرام　　صد تحفۂ خوش ز زردم آورده بشام

گر پای تو در میان بنا شد نرسد　　هجوران را ز جانب دوست پیام

آمد سحر آن دلبر خونین جگران　　گفت ای ز تو بر خاطر من بار گران

شرفت باد که من بسویت نگران　　با شم تو نهی چشم بسوی دگران

تا گرد گل تو سنبل آمد بیرون　　صد ناله ز من چو بلبل آمد بیرون

پیوسته ز سبزه گل برون می آید　　ای طرفه که سبزه از گل آمد بیرون

ای باعث شوق و طلبم خوبی تو　　فرع طلب من است مطلوبی تو

گر آئینہ محبی من بنود　　ظاهر نشود جمال محبوبی تو

خوش حال مجردی جهان پیمائی　　دز نیک و بد زمانه . . . . . ئی

خورشید صفت سیر کنان در عالم　　هر روز به منزلی و هر شب جائی

(نی) در حرم قدس تو کس را جائی　　عالم بتو پیدا و تو خود پیدائی

ما و تو ز هم جدا نه ایم اما هست　　ما را بتو حاجت و ترا با مائی

گر در دل تو گل گذرد گل باشی　　در بلبل بیقرار بلبل باشی

تو جزوی و حق کل ست اگر روزی چند　　اندیشہ کل پیشه کنی کل باشی

ای برده گمان که صاحب تحقیقی　　وندر صفت صدق و یقین صدیقی

هر مرتبه از وجود حکمی دارد　　گر حفظ مراتب نکنی زندیقی

گه جلوه گر از عارض گلگون باشی　　گه خنده زن از لولوی مکنون باشی

در پرده چنین لطیف و موزون باشی　　آن لحظه که بی پرده شوی چون باشی

دیوان کامل جامی[1] میں سات شعروں کی ایک غزل ہے جس کا ایک شعر اس بیاض میں موجود ہے، مگر اسی بیاض میں اسی غزل کا حسب ذیل شعر بھی دیا ہوا ہے، جو اس مطبوعہ نسخہ میں موجود نہیں ہے۔

نیست در بادیۂ عشق نظر لیلی را
جز بر آن لاله که با داغ دل مجنون است

---

[1] دیوان کامل جامی (صفحہ ۲۴۰-۲۴۱) ویراستہ ہاشم رضی، انتشارات پیروز چاپخانۂ پیروز۔

آہ! شوکت سلطان

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا
دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

از سید صباح الدین عبدالرحمٰن

۸/۹ جنوری ۱۹۸۶ء کو دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں اسلامی ادب پر ایک بین الاقوامی سمینار تھا، جس میں ہندوستان کے علاوہ عرب ممالک کے علماء اور فضلاء بھی کافی تعداد میں شریک تھے، وہیں جناب سید حامد صاحب سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے یہ اندوہناک خبر دی کہ شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج کے سابق پرنسپل جناب شوکت سلطان کی وفات ہوگئی، یہ خبر سننے کے لیے تیار نہ تھا، اعظم گڈھ سے ۶؍جنوری کو لکھنؤ گیا تھا، اس وقت تک ان کی کسی علالت کی کوئی اطلاع نہ تھی، وہ اپنی بڑی لڑکی سے ملنے علی گڑھ گئے ہوئے تھے، اعظم گڈھ سے لکھنؤ ان کی وفات کی کوئی خبر نہیں تھی، بے حد پریشان اور ملول ہوا، خیال ہوا کہ علی گڈھ سے ان کی میت اعظم گڈھ ضرور آئے گی، اور شبلی منزل کے احاطہ ہی میں ان کی ابدی آرام گاہ بنائی جائے گی، غایت پریشانی میں لکھنؤ سے اعظم گڈھ روانہ ہوا، کہ شاید جنازہ میں شرکت ہو جائے، یہاں پہونچا تو معلوم ہوا کہ وہ ۳۰؍دسمبر ۱۹۸۵ء کو اپنی اہلیہ کے ساتھ لڑکی سے ملنے کے لیے للت پور گئے، ۵؍جنوری کو فجر کی نماز کے لیے اٹھے، وضو کا پانی مانگا تو کچھ تکلیف محسوس کی، چارپائی پر لیٹ گئے تو پھر ابدی نیند سو گئے، وہیں اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور برکتوں کی آغوش میں سپرد کر دیے گئے، اس سانحہ کی خبر ۹؍جنوری کی شام کو اعظم گڈھ پہونچی ہیں، ۱۰؍جنوری کو دارالمصنفین پہونچا تو جمعہ کی نماز کے بعد اسی کے احاطہ میں ان کے جنازہ کی غائبانہ نماز پڑھی گئی، اس میں شریک تو ہو گیا، مگر یہ خیال اب تک چھایا ہوا ہے کہ جہاں ان کی زندگی پروان چڑھی تھی، جہاں کے لوگوں کے دلوں میں انھوں نے جگہ بنائی تھی، جہاں کی تاریخ میں ان کے روشن کارناموں کی یاد برابر باقی رہے گی، وہاں سے دور ایک دیار غیر میں ان کی آخری آرام گاہ بننے میں کیا مصلحتِ خداوندی

ہے، ان کے وطن میں ان کا جنازہ دھوم سے اٹھتا، یہاں کے قابل ذکر ہندو مسلمان میں شاید ہی کوئی ایسا ہوتا جو اس میں شریک نہ ہوتا، اور ان کے کارنامے کا ذکر ان کی نوک زبان پر نہ ہوتا، اس فانی دنیا کی زمین کا ہر خطہ تو اللہ تعالیٰ ہی کا ہے، وہ جس جگہ سپرد خاک کیے گئے وہ بھی رب العالمین ہی کی ہے، مگر یہ اعظم گڈھ کی سرزمین کی محرومی ہے کہ اس سے ایک نامور فرزند کی تربت اس کے یہاں کے بجائے اس نیلے فام آسمان کے نیچے کہیں اور بن گئی،

ان کا سال پیدائش ۱۹۱۳ء تھا، بہتر ۷۲ سال کی زندگی گذار کر ۵؍جنوری ۱۹۸۶ء کو اپنے اہل و عیال، عزیزوں اور قدردانوں کو اپنی یاد میں آنسو بہانے کے لیے چھوڑ گئے، ان کی اچانک موت انسانی زندگی کے لیے یہ پیام ہے کہ زندگی کیا ہے محض ایک طائر ہے جو

شاخ پر بیٹھا کوئی اور دبہچایا، اڑ گیا

ان کی زندگی طوفانی ہنگاموں کی تو نہ تھی لیکن تعمیری کاموں سے ضرور معمور رہی، وہ اعظم گڈھ کے ایک بہت ہی سربرآوردہ خاندان سے تھے، ان کے دادا جناب مرزا محمد سلیم نے دیوبند میں تعلیم پائی، مگر وکالت کا پیشہ اختیار کیا، علامہ شبلی نعمانی نے اپنے باغ میں دارالمصنفین قائم کیا تو جناب مرزا محمد سلیم نے اسی سے ملحق اپنے باغ کی زمین بھی اس کے لیے وقف کی، ان کے فرزند ارجمند جناب مرزا سلطان احمد اپنے زمانہ کے بڑے نامی گرامی سرکاری عہدیدار تھے، پہلے ڈپٹی کلکٹر کے عہدہ پر فائز ہوئے، پھر ترقی کر کے کلکٹر ہو گئے، آخر میں بورڈ آف ریونیو کے ممبر بن کر پنشن پائی، وہ اپنی شرافت اخلاق کے لیے بھی مشہور رہے، ان کا دل ہیرے کی طرح صاف اور شفاف تھا، وہ دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کے بھی رکن رہے، ان کے بعد ان کے چھوٹے بھائی جناب مرزا احسان احمد نے بھی اس ادارہ کی مجلس انتظامیہ کا رکن بننا منظور کیا، وہ بڑے اچھے شاعر اور ادیب کی حیثیت سے بھی مشہور تھے، جگر مرادآبادی کو ان ہی نے شعر و ادب کی دنیا میں روشناس کیا، جناب شوکت سلطان، جناب مرزا سلطان احمد کے بڑے لڑکے اور مرزا احسان احمد کے بھتیجے تھے، ان کی

شادی علامہ شبلی نعمانیؒ کی منجھلی پوتی سے ہوئی تھی، دارالمصنفین سے ان کے خاندانی تعلقات کی وجہ سے اس کی مجلسِ انتظامیہ و مجلس ارکان کے رکن بھی بنائے گئے۔

انھوں نے الہ آباد یونیورسٹی سے فارسی میں ایم. اے اور ایل. ایل. بی بھی کیا، اعظم گڈھ میں کچھ دنوں وکالت کرنے کے بعد شبلی نیشنل کالج میں فارسی کے لیکچرار ہوگئے، جس کے بعد وہ اس کالج کے لیے لازم و ملزوم بن گئے۔ یہ کالج سنہ ۱۹۴۰ء تک محض ایک ہائی اسکول تھا، مگر اس کی اہمیت اس لیے تھی کہ علامہ شبلی نعمانیؒ نے اس کو سنہ ۱۸۸۴ء میں قائم کیا تھا، جب جناب بشیر احمد صدیقی مرحوم اس کے ہیڈ ماسٹر ہوئے تو انھوں نے اپنی مساعی جمیلہ سے اس کو سنہ ۱۹۴۰ء میں انٹر کالج بنایا جو اس ضلع میں پہلا انٹر کالج تھا، اس لیے اس کے معرض وجود میں آنے پر غیر معمولی خوشی منائی گئی، جناب بشیر احمد صدیقی ہی کی کوشش سے یہ انٹر کالج سنہ ۱۹۴۶ء میں ڈگری کالج ہوگیا، اور جب وہ یہاں سے سنہ ۱۹۵۰ء میں پاکستان جانے لگے تو انھوں نے جناب شوکت سلطان کو اپنا جانشین بنایا۔

پرنسپل کے عہدہ پر فائز ہونے کے بعد انھوں نے اپنی دانا، بینا اور توانا شخصیت کو بہت ہی متحرک، جاندار، بارسوخ اور بااثر بنادیا، تعلیم کے کسی محکمہ میں پہونچ جاتے تو مشکل سے مشکل کام اپنی خواہش کے مطابق کرا لیتے، یہ کالج پہلے آگرہ یونیورسٹی سے ملحق تھا، پھر گورکھپور یونیورسٹی سے منسلک ہوگیا، ان دونوں یونیورسٹیوں کے کسی جلسہ میں شریک ہوتے تو ان کی موثر شخصیت ان کے جلوہ میں ہوتی، کسی بھی دفتر کے قلم کو اپنی پاٹ دار آواز کی تلوار سے کاٹ کر رکھ دیتے، وہ کسی منطقیانہ نتیجہ کو ثابت کرنے میں صغریٰ کو کبریٰ اور کبریٰ کو صغریٰ بنانے میں ماہر تھے، وہ جب کسی سے باتیں کرتے تو اپنی آواز کی کڑک اور گرج سے اپنے مخاطب کو سرنگوں ہونے پر مجبور کردیتے۔

وہ کالج میں پرنسپل کے کمرہ میں ہوتے تو اس کے در و دیوار بھی ان کے سامنے جھکتے نظر آتے، وہ اس کمرے سے نکل پڑتے تو معلوم ہوتا کہ کوئی ضیغم اپنے کچھار سے نکل پڑا ہے، اساتذہ، طلبہ اور تمام ملازمین اپنی اپنی جگہوں پر ساکت و صامت دکھائی دیتے، اور اپنے فرائض کی ادائیگی میں مشغول ہوجاتے، یو۔پی کے ڈگری پوسٹ گریجویٹ کالجوں کے نامور پرنسپلوں کی جب کبھی تاریخ مرتب کی جائے گی تو اس میں ان کا ذکر خیر جلی حرفوں سے کیا جائے گا، ان کا ایک بہت بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے اس کالج کو یہاں کے لوگوں کی تعلیمی امیدوں کا مرغزار اور ان کی زندگی کی امنگوں کا سمن زار بنادیا، جب یہ ڈگری کالج بنا تھا تو خیال تھا کہ یہ مشکل سے اپنی زندگی کے مراحل طے کرسکے گا، مگر انھوں نے اپنی غیر معمولی کارکردگی سے اس میں پہلے لا کلاس، پھر بی ایڈ کلاس کھلوائے، اور پھر بہت جلد سوشیولوجی، اردو، ہندی، سائیکلوجی، جغرافیہ، فزکس، کیمسٹری، زولوجی، بوٹنی اور میتھمیٹکس کے لیے ایم. اے کلاسز کھلوانے میں کامیاب ہوئے، وہ اپنی اس کامیابی پر بجا طور سے ناز کرسکتے تھے، ضلع کے لوگ بھی برابر ان کو یاد کرکے ان کی ذات پر فخر کریں گے کہ ان کی وجہ سے گھر گھر اعلیٰ تعلیم پھیلی، اب تک اس کالج کی بدولت خدا جانے کتنے وکیل ہوچکے ہیں، بی ایڈ کی ڈگری کی وجہ سے سینکڑوں خاندانوں کی پرورش ہورہی ہے، بہت سے طلبہ سائنس کی تعلیم پاکر ملک کے مختلف حصوں میں برسر روزگار ہوگئے ہیں، وہ اگر ریٹائر نہ ہوتے تو شاید انجینیرنگ اور میڈیکل کالج قائم کرکے اس کو یونیورسٹی بھی بنادیتے، ان کے زمانہ میں بڑی بڑی عمارتیں بھی تعمیر ہوئیں، وہ اس کے احاطہ میں گھومتے تو اس کو دیکھ کر ایسے ہی خوش ہوتے جیسے ایلورا اور اجنتا کے مصوروں کو اپنی مصوری دیکھ کر خوشی ہوتی ہوگی، اس کے در و دیوار ان کو یاد کرکے برابر کہتے رہیں گے ؎

یاد سے تیری دلِ درد آشنا معمور ہے

کالج کے نظم و نسق میں وہ فولاد کی طرح سخت رہے، اس کی خاطر ان کی زبان بھی فولادی بن جاتی، مگر ان کا دل حریر و پرنیان کی طرح نرم رہا، ان کے والد بزرگوار ہی کی طرح ان کا دل ہیرے کی طرح صاف اور آبدار تھا، اپنی پرنسپلی کے زمانہ میں کسی کو مالی نقصان نہیں پہونچایا، ان کے ماتحت از کار رفتہ یا مفلوج ہی کیوں نہ ہوجاتے، ان کو کسی نہ کسی طرح کالج کی ملازمت سے وابستہ رکھتے۔

ان کی نجی زندگی بڑی پاکیزہ رہی، دو مرتبہ حج بیت اللہ کا شرف حاصل کیا، صوم و صلوٰۃ کے بڑے پابند رہے، شاید ہی کبھی رمضان شریف کے روزے چھوڑے ہوں، نماز باجماعت کا بڑا اہتمام کرتے، فجر کی نماز کے بعد تلاوت کلام پاک ضرور کرتے، ریل کے سفر میں بھی پلیٹ فارم پر بیٹھے تلاوت کرتے دکھائی دیتے، رمضان شریف میں کبھی بارہ تیرہ ختم قرآن کرتے، اشراق، چاشت اور اوابین کے بھی پابند ہو گئے تھے، بزرگان دین کی خدمت میں بھی حاضر ہونے کا شوق تھا، کبھی کبھی رمضان شریف کے آخری عشرہ کے کچھ دن ان کے یہاں گذارتے، غیبت سے سخت نفرت کرتے، کسی کو کچھ کہنا ہوتا تو برملا اس کے منھ پر کہہ دیتے، اس کی غیبت کرنا یا سننا پسند نہ کرتے، غریبوں کی مدد کرنے میں پیش پیش رہتے، زکوٰۃ پابندی سے ادا کرتے، موت سے بالکل نہیں ڈرتے، ان کو شاید یہ خیال کبھی نہیں آیا کہ ع موت اک چبھتا ہوا کانٹا دلِ انسان میں ہے،

اپنی آخر زندگی میں وہ اس کا ذکر کرتے تو معلوم ہوتا کہ ع موت سے ہو رہے ہیں ناز و نیاز

وہ دولت پور پہونچے تو ایک روز گھومتے ہوئے وہاں کے قبرستان پہونچ گئے، اس کو دیکھتے ہی بولے بڑی خوبصورت جگہ ہے، کیا معلوم تھا کہ ان کے حسن انتخاب کی داد ان کو فوراً ہی مل جائے گی، ان کو سفر کرنے کا بڑا شوق رہا، حضر سے زیادہ ان کو سفر پسند تھا، کھانے اور کھلانے کا بھی ذوق رہا، بہت کم کھاتے، مگر دعوتوں میں شریک ہو کر بہت لطف اندوز ہوتے۔

دارالمصنفین سے ان کو بڑا قلبی لگاؤ رہا، اس کی تعمیر اور ترقی کے مشوروں میں برابر شریک رہے، اعظم گڈھ میں اس ادارہ کے باوقار قدردانوں اور باوزن ہمدردوں کا جو پرانا حلقہ تھا اس میں زیادہ تر اس دار فانی سے رخصت ہو چکے ہیں، مرزا سلطان احمد، مرزا احسان احمد، مرزا مرتضےٰ بیگ، اقبال سہیل، شاہ محمد اسحاق وکیل، شاہ علاء الحق وکیل، محمد صابر مختار، محمد علی مختار، ظہور احمد مختار، قاضی محمد صادق وکیل، صلاح الدین وکیل، ضیاء الدین وکیل، حکیم محمد اسحٰق، مبین احمد ڈپٹی کلکٹر صاحبان دارالمصنفین کے

جو مخلصانہ تعلقات رکھتے تھے اس کی یادوں کی جوت سے ذہن اب بھی جگمگا اٹھتا ہے، شوکت سلطان صاحب اپنی وضعداری اور محبت میں اسی زریں سلسلہ کی ایک کڑی تھے، اجل نے اس کے ایک اور مہربان کو اس سے چھین لیا۔

وہ دنیا سے اس لحاظ سے خوش اور مطمئن گئے کہ ان کے تینوں لڑکے اچھے اچھے عہدوں پر مامور ہیں اور ان کے تینوں داماد بھی اچھی اچھی ملازمتوں پر فائز ہیں، وہ اپنی تمام اولاد کی زندگیوں کی بہاریں دیکھ کر گئے، البتہ ان کی اہلیہ اب ان کی یادوں کے سوز پنہاں کا مزار اپنے دل کے اندر بنائے رکھیں گی، ہاں یادش بخیر ان کی ساس یعنی علامہ شبلی نعمانیؒ کی بہو ابھی بقید حیات ہیں، اس سے پہلے اپنے بڑے اور منجھلے داماد کی وفات پر خون کے آنسو بہا چکی ہیں، اس سانحہ کے بعد ان کے دیدۂ گریاں اور دلِ بریاں کی جو کیفیت ہوگی اس کا صرف اندازہ کیا جا سکتا ہے، دعا ہے کہ اس خاندان کو صبر جمیل عطا ہو۔ آمین

مرحوم سے میری پہلی ملاقات ۱۹۳۵ء میں ہوئی، جب ان کا مستقل قیام اعظم گڈھ میں رہنے لگا تو روز بروز ان سے قریبی تعلقات بڑھتے گئے، خدا جانے کتنے مسائل اور معاملات میں ان کا تعاون حاصل رہا، ایسا بھی ہوا کہ وہ کبھی تیز اور گرم گفتگو کر جاتے، مگر ان کی بڑی خوبی یہ تھی کہ تھوڑی ہی دیر میں یہ محسوس کرا دیتے کہ جیسے کوئی گفتگو ہی نہیں ہوئی، اس لیے ہم دونوں کے تعلقات میں کبھی ناخوشگواری اور دوری پیدا نہیں ہوئی، بلکہ ان کے اخلاص اور محبت پر مکمل اعتماد رہا۔

جانے والے تو جا چکا، جا! الوداع! خدا حافظ، تجھ کو سلام، ہزاروں سلام، تجھ پر لاکھوں سلام، ہر بن مو سے یہ دعا نکل رہی ہے کہ تیری لحد میں رحمت الٰہی تیری ہم آغوش ہو، برکتِ خداوندی تجھ سے ہم کنار ہو، اور بارگاہِ ایزدی میں اس کے بے پایاں اکرام کی کوثر اور بے انتہا الطاف کی تسنیم سے تو برابر سیراب ہوتا رہے، آمین ثم آمین

مطبوعات جدیدہ

طبِ نبویؐ: تالیف علامہ ابن قیم الجوزیہؒ، ترجمہ حکیم مولانا عزیز الرحمن اعظمی، تصحیح و تقدیم مولانا مختار احمد ندوی، کاغذ و کتابت بہتر، طباعت نہایت عمدہ، صفحات ۴۴۳، مجلد مع دیدہ زیب گرد پوش، قیمت ۶۰ روپیے،

پتہ: دار المعارف ۱۳ محمد علی بلڈنگ، بھنڈی بازار، بمبئی ۴۰۰۰۰۳۔

زاد المعاد حافظ ابن قیمؒ کی شہرۂ آفاق تصنیف اور سیرت نبویؐ کی بہت ممتاز کتاب ہے، اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و شمائل کو عجیب والہانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے، اس کی دوسری جلد کا زیادہ حصّہ طب نبویؐ کے مباحث پر مشتمل ہے، جس میں طب نبویؐ کے اسرار و حکم اور فوائد بیان کیے گئے ہیں، شروع میں دل اور جسم کی بیماریوں اور ان کی مختلف صورتوں اور ان کے علاج اور نبوی طریقۂ علاج پر اصولی باتیں تحریر کی گئی ہیں، پھر ہر قسم کی جسمانی بیماریوں کے متعلق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث نقل کی گئی ہیں اور حروف تہجی کے اعتبار سے ان تمام دواؤں، غذاؤں اور مفردات کا ذکر کرکے ان کے طبی خواص و فوائد بیان کیے ہیں، جن کے بارے میں حدیثیں وارد ہیں، امراض و معالجات کے ضمن میں عشق و محبت کے مرض و علاج، محبت کی حقیقت و کیفیت، اس کے طبعی اسباب، اس کے اقسام و درجات اور پھر ان کے علاج و تدبیر کا تذکرہ کیا ہے، اس طرح مختلف امراض اور ان کی نوعیتوں اور ادویہ و اغذیہ کے متعلق ہر قسم کے اصولی و جزئی مسائل اس کتاب میں درج ہیں، اور جہاں طبی و فنی حیثیت سے ان پر بحث و گفتگو کی ہے وہاں فقہی و حدیثی نوعیت سے بھی ان پر کلام کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روحانی اور جسمانی دونوں طرح کی بیماریوں کے مسیحا اور طبیب حاذق تھے، اور آپؐ نے جس طرح لوگوں کے قلوب و ارواح کا تزکیہ کیا اسی طرح انھیں صحت بخش زندگی کے اصول، حفظان صحت کے آداب اور اشیا کے خواص سے بھی آگاہ فرمایا، الدار السلفیہ بمبئی علمی و دینی کتابوں کی اشاعت کا ایک بڑا

مرکز ہے، اس کے سربراہ مولانا مختار احمد ندوی نائب صدر مرکزی جمعیۃ اہل حدیث متعدد دینی کتابوں کے مصنف و مترجم ہیں، ان کی نگرانی میں اس ادارہ نے عربی و اردو کی بیشمار کتابوں کے علاوہ عربی کی متعدد بلند پایہ کتابوں کے اردو ترجمے بھی شایع کیے ہیں، اب اس نے زاد المعاد کے اس حصہ کا بھی اردو ترجمہ شایع کیا ہے جو طب نبویؐ پر مشتمل ہے، ترجمہ حکیم مولانا عزیز الرحمن لکچرار جامعہ طبیہ دیوبند نے کیا ہے جو اس کے صحیح اور اچھے ہونے کی ضمانت ہے، اور مولانا مختار احمد ندوی نے حواشی میں احادیث کی تخریج کی ہے، مگر اصل کتاب کے سلسلہ میں یہ امر قابل لحاظ ہے کہ اس میں بیماریوں اور دواؤں کے متعلق صحیح ضعیف اور موضوع ہر قسم کی حدیثیں جمع کردی گئی ہیں علاوہ ازیں ان حدیثوں کی حیثیت تبلیغی اور تشریعی نہیں ہے، بلکہ وہ عموماً آپ کے اور اہل عرب کے عادات و تجارب پر مبنی ہیں، تاہم عام مسلمانوں کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر قسم کے ارشادات عظمت و محبت کے لایق ہوتے ہیں، اس حیثیت سے حافظ ابن قیمؒ کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے اس قسم کی تمام حدیثوں کو یکجا کردیا ہے، گو طب کے فن نے اب بڑی ترقی کرلی ہے مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اکثر ہدایات طب جدید کے عین مطابق ہیں، مولانا مختار احمد ندوی اس کو اردو میں منتقل کرانے پر تبریک و تحسین کے مستحق ہیں، ہر مسلمان کے لیے اس کا مطالعہ ہم خرما و ہم ثواب کے مصداق ہے۔

معروضات: مرتبہ جناب سید ارتضی احسین صاحب، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۱۹۸، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۵۵ روپیے پتہ: شیخ غلام علی اینڈ سنز کراچی، لاہور، حیدرآباد (پاکستان)۔

جناب سید ارتضی احسین صاحب پاکستان میں مختلف اہم سرکاری عہدوں پر فائز رہنے کے علاوہ کئی ملکوں میں اس کے سفیر بھی رہے، ان مشغولیتوں کے باوجود انھوں نے علم و ادب سے بھی اپنا اشتغال قائم رکھا، اور وہ اردو اور انگریزی میں تحریر و تصنیف کا کام بھی کرتے رہے، زیر نظر کتاب ان کی بعض تقریروں اور مضامین کا مجموعہ ہے، ان کو ادب و تنقید کے موضوع سے زیادہ دلچسپی ہے، اس مجموعہ کا زیادہ حصہ ان کی ادبی و تنقیدی نگارشات ہی پر مشتمل ہے، لیکن اس کی ابتدا انھوں نے سیرت سے متعلق اپنی تین ۳ تقریروں سے کی ہے جو رنگون میں جلسۂ عید میلاد النبی ۴

کے موقع پر سنہ ۷۶ء و سنہ ۷۷ء میں کی گئی تھیں، ان میں انسانی نفسیات، علم اور جہاد سے متعلق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات عالیہ کی موثر انداز میں وضاحت کر کے ان پر عمل کرنے کی دعوت دی گئی ہے، ادبی و تنقیدی حصہ میں دس مضامین درج ہیں، اس سلسلہ کا پہلا مضمون اصول تنقید ہے، اس میں انھوں نے نقاد کو کئی ضروری اور اہم باتوں کی جانب توجہ دلائی ہے، اور شاعر کی شخصیت کے مطالعہ پر زور دیا ہے، ایک مضمون میں یہ دکھایا ہے کہ مستقبل میں کن اصناف ادب کے زیادہ مروج و مقبول ہونے کے امکانات ہیں، اس سلسلہ میں آزاد نظم پر بھی گفتگو کی ہے مگر اس کے بعض اسقام بھی بتائے ہیں، ایک مضمون میں غالب کی اردو شاعری میں طنز کی جو مختلف صورتیں ملتی ہیں ان کی نشاندہی کی ہے، اقبال کے فلسفہ و شاعری پر بحث کرتے ہوئے ان کے عقیدہ و نظریہ کی خاص طور پر وضاحت کی گئی ہے، اس میں ان کی عجمیت و بے یقینی سے نفرت و بیزاری، نظریۂ خودی، نظریۂ حیات، مرد مومن، اسلام سے تعلق، آفاقیت اور انسان دوستی وغیرہ پر اچھی بحث ہے، ایک اور مضمون میں تین ہم عصر شاعروں فیض، مجاز اور جذبی کی شاعرانہ خصوصیات پر سیر حاصل تبصرہ کر کے ان کا تجزیہ و تقابل کیا ہے، ایک مضمون سلام مچھلی شہری کے لیے خاص ہے اس میں ان کی شاعری کے بعض نمایاں پہلوؤں کا ذکر ہے، دو اچھے مضامین امیر خسرو پر بھی ہیں، یہ ان کی سات سو سالہ برسی کے موقع پر لکھے گئے تھے، ایک مضمون "ایک بھولا بسرا ناول" کے عنوان سے ہے، اس میں ۱۹۱۷ء میں شایع ہونے والے ایک ناول "شوکت آرا بیگم" پر بڑا مبسوط تبصرہ کیا گیا ہے، آخری حصہ "منظومہ" میں صرف ایک غزل درج ہے، ان سب مضامین سے مصنف کے سنجیدہ اور ستھرے ادبی و تنقیدی ذوق کا پتہ چلتا ہے، گو اکثر مضامین تقریباً چالیس برس قبل کے لکھے ہوئے ہیں، تاہم ان میں خالص ادب کی تر و تازگی باقی ہے اس لیے اب بھی ان میں ادبی ذوق کی تسکین کا سامان موجود ہے، مگر کہیں کہیں بعض لفظوں کے استعمال میں بے احتیاطی ہو گئی ہے، جیسے "اس کے لیے کہیں اجتماع ضدین صرف فرمایا ہے، کہیں اجتماع مماثل" (ص ۱۱)، "اگر اس طرح اس کی طبیعت کو منی رج نہ ملتے" (ص ۷۰) اسی طرح رضا کے بجائے رضائیت (ص ۱۴ و ۱۵) ناکافی کے بجائے ناکافیت (ص ۴۶ و ۹۳) ناگزیر کے بجائے ناگزیریت (ص ۱۵) اور تبلیغاتی ادب (ص ۵۰) لکھا گیا ہے اور بجائے کا املا ہر جگہ بجاء درج ہے، کتابت کی غلطی سے مضمون کو ممنوع (ص ۱۶) موضوعاتی کو موضا عاتی (ص ۵۳) ذوق مزاح کو ذوق مذاح (ص ۷۰) مسئلہ کو مسعلہ (ص ۱۱) لکھا گیا ہے۔

"ض"

سلسلۂ مذہبی رواداری

تاریخ ہند کا سلسلہ اب تک اٹھائیس کتابوں تک پہنچ چکا ہے، اسی ضمن میں ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری کا بھی ایک سلسلہ ہے، جو تین جلدوں پر مشتمل ہے،

جلد اول اس میں مغل دور سے پہلے کے مختلف خاندانوں کے مسلمان حکمرانوں مثلاً محمد بن قاسم، محمود غزنوی، شہاب الدین غوری، علاء الدین خلجی، محمد بن تغلق وغیرہ کی مذہبی رواداری و حب وطنی کے واقعات پیش کئے گئے ہیں، قیمت [illegible] روپے،

جلد دوم اس میں مغل فرماں روا بابر، ہمایوں، سوری خاندان کے حکمراں، شیر شاہ، اسلام شاہ، پھر مغل شہنشاہ اکبر، جہانگیر و شاہجہاں کی مذہبی رواداری وغیرہ کے دلچسپ واقعات قلمبند کئے گئے ہیں، قیمت ۲۳ روپے،

جلد سوم ہندوستان کے مغل عہد کے مشہور مورخ سر جدو ناتھ سرکار کی کتاب کا جواب خود ان کی کتاب کے حوالوں سے اس طرح پیش کیا گیا ہے، کہ اورنگ زیب عالمگیر اور اس کے بعد کے مغل بادشاہوں کی مذہبی رواداری وغیرہ کی تفصیلات آگئی ہیں، مولانا شبلی کی مضامین عالمگیر، اور مولانا سید نجیب اشرف صاحب ندوی مرحوم کی مقدمہ رقعات عالمگیر کے بعد اورنگ زیب عالمگیر پر دوسری اہم اور پر از معلومات کتاب جس میں اس کے پورے پچاس سالہ عہد حکومت و فرمانروائی کی پوری تاریخ آگئی ہے، قیمت :- ۳۰ روپے،

اسلام کی مذہبی رواداری :- اس میں مستند حوالوں سے مذہبی رواداری، غیر مسلم رعایا کے ساتھ سلوک اور ذمیوں کے حقوق کے متعلق مذہب اسلام کی تعلیمات اور ان پر مسلمانوں کے عمل کا اسوہ پیش کیا گیا ہے، (زیر طبع)

"مرتبہ"

سید صباح الدین عبدالرحمن

جلد ۱۳۷　ماہ جمادی الثانی ۱۴۰۶ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۸۶ء　عدد ۲

مضامین